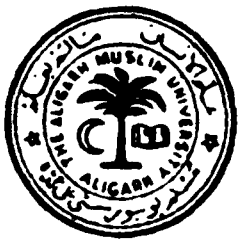

THE QURANIC TERMS AND THEIR ORIGIN IN PRE-ISLAMIC LITERATURE: A CRITICAL STUDY

DISSERTATION SUBMITTED FOR THE DEGREE
OF

Master of Philosophy

IN

ARABIC

BY

ASHHAD JAMAL

UNDER THE SUPERVISION OF

PROF. ABDUL-BARI

DEPARTMENT OF ARABIC
ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY
ALIGARH (INDIA)
1994

قرآنی اصطلاحات

ادب جاہلی میں ان کے ابتدائی نقوش کا تنقیدی مطالعہ

مقالہ برائے

ایم۔ فل

زیرِ نگرانی:

پروفیسر عبد الباری

مقالہ نگار:

اشہد جمال

شعبۂ عربی

مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

۱۹۹۴ء

DS2659

Ds. 2659

Phones [External : 7162
Internal : 234

DEPARTMENT OF ARABIC
ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY
ALIGARH-- 202002

Dated 21.06.95

CERTIFICATE

This is to certify that **Mr. Ashhad Jamal** has completed his M.Phil. work entitled **"The Quranic Terms and their origin in Pre-Islamic Literature: A Critical Study"**. The dissertation embodies the findings and results of investigation conducted under my supervision.

The work is original. It is now forwarded for the award of M.Phil. degree in Arabic.

Abdul Bari

(Prof. Abdul Bari)
Supervisor

فہرست

مقدمہ ۶

باب اول: قرآنی اصطلاحات۔ابتداء وارتقاء ۱۵

لغت میں تبدیلی وارتقاء کی روایت ۱۶

صوتی تغیرات اور اس کے مظاہر ۲۱

معنوی ارتقاء۔عوامل ومظاہر ۲۳

معنوی ارتقاء کے عوامل ۲۳

لغوی تغیرات کے نتائج ومظاہر ۲۶

(الف) ترادف ۲۶

(ب) لفظی اشتراک ۲۸

(ج) تضاد ۲۹

(د) اصطلاح سازی ۲۹

اصطلاح کا مفہوم ۲۹

قرآنی اصطلاحات ۳۲

باب دوم: قرآنی اصطلاحات۔تحقیق وتنقید ۳۵

فصل اول عقیدہ وعمل ۳۶

توحید/واحد/احد ۳۷

اللہ/الٰہ ۴۱

رب ۴۴

الجبار/تو ۴۸

الصمد ۵۱

السبحان والتسبيح ٥٣
الرحمن والرحيم ٥٧
قضاء وقدر ٦٠
الرسالة والنبوة ٦٣
الآخرة ٦٦
الاسلام ٦٩
الايمان ٧٥
الكفر والكافر ٧٨
الشرك والمشرك ٨٢
النفاق والمنافق ٨٣
الفسق والفاسق ٨٧
الظلم والظالم لنفسه ٨٩
فصل دوم : فرائض وعبادات ٩٢
العبادة ٩٣
الصلوٰة ٩٦
الطهارة ٩٩
الوضوء ١٠١
التيمم ١٠٣
الأذان ١٠٦
الركوع ١٠٨
السجدة ١١١
الزكوٰة ١١٣
الصدقة ١١٥

الصوم ۱۱۸
الحج ۱۲۰
العمرة ۱۲۳
المناسک ۱۲۵
الطواف ۱۲۷
الکعبة ۱۲۹
الجهاد فی سبیل الله ۱۳۱
فصل سوم : رشد وهدایت ۱۳۵
الدین ۱۳۶
الشریعة ۱۴۳
المعروف والمنکر ۱۴۶
التقوی ۱۵۱
الذکر ۱۵۴
المغفرة والاستغفار ۱۵۶
الحلال والحرام ۱۵۹
الجاهلیة ۱۶۳
کتابیات ۱۶۶

مقدمہ

قرآن مجید بلاشبہ اللہ تعالیٰ کی سب سے بڑی نعمت اور بندوں کی سب سے اہم ضرورت ہے، یہ تمام بنی نوع انسان کیلئے واحد اور مکمل ضابطۂ حیات ہے، جو زندگی کے تمام شعبوں میں مکمل ہدایت و رہنمائی کے لئے نازل ہوا ہے۔ قرآن مجید نے خود اپنا تعارف رہبر ہدایت (البقرہ ۱۸۵) معلم اخلاق (ہود ۱۲۰) محرک عبادت (کہف ۲) خزانۂ حکمت (اسراء ۳۹) قول فیصل (طارق ۱۳) احسن الحدیث (زمر ۲۳) اور محترم و پاکیزہ کتاب کی حیثیت (ق ۱) سے کرایا ہے۔ اس کے اولین مخاطب اور معلم رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تھے جن کی ذاتِ گرامی بجائے خود قرآن مجید کی چلتی پھرتی تفسیر تھی،[1] آپؐ نے اپنی زندگی کو اس کی ہدایات و تعلیمات کا مکمل نمونہ بنایا، اور اپنی امت کو انہیں اپنی زندگیوں میں نافذ کرنے کی تلقین فرمائی، آپؐ نے ارشاد فرمایا "یہ علم و فن کا بحر زخار ہے، اس کے عجائبات کبھی ختم ہونے والے نہیں ہیں،[2] اور جو اس کو مضبوطی سے پکڑے رکھے گا کبھی گمراہ نہ ہوگا۔[3]

آپؐ کی فہمائش کے مطابق قرآنی عجائبات کی تلاش و جستجو اور "حبل اللہ المتین" کو حرز جاں بنانے کے جذبہ سے یہ کتاب الٰہی روز اول سے خصوصی توجہ کا مرکز رہی ہے، ہر دور کے علماء و محققین نے قرآن مجید اور اس کی نسبت سے نشو و نما پانے والے علوم میں غیر معمولی دلچسپی دکھائی، اور قرآنیات کے مختلف میدانوں میں گراں قدر خدمات انجام دیں، معاصر زمانہ میں بھی اس طرح کی تحقیقات و نگارشات کا سلسلہ برابر جاری ہے، اور علماء تفسیر و محققین قرآنیات

---

[1] سنن ابی داؤد، کتاب الصلوٰۃ، باب الصلوٰۃ فی اللیل؛

[2] جامع ترمذی، ابواب فضائل القرآن، باب ماجاء فی فضل القرآن، [3] حوالہ مذکور؛

کی کاوشوں سے قرآن فہمی کے بہت سے نئے پہلو سامنے آرہے ہیں، زیرِ نظر مقالہ بھی اسی سلسلے کی ایک کوشش ہے۔

قرآن مجید کا تعلق زمانہ ماقبل نزول کے ماحول و ادب سے بہت گہرا ہے، یہ اسی کلاسیکی زبان و ادب میں نازل ہوا اور اپنے معجزانہ اختصاص کی وجہ سے اس ادب کو بھی زندہ جاوید بنا دیا۔ زبانوں کی تاریخ کا یہ نہایت زریں باب ہے کہ قرآن مجید کے جادوئی اسلوب اور معجزانہ طرزِ بیان نے اہلِ زبان کو جس قدر متاثر کیا، یہ اپنے آپ میں بے نظیر ہے۔ جزیرۃ العرب کے وہ شعراء و ادباء بھی جن کی نگارشات عظمت کے اعتراف میں کعبۃ اللہ میں آویزاں کی جاتی تھیں، اس ادبِ عالی کی جلوہ آفرینی کی تاب نہ لا سکے۔ یہاں تک کہ بعض نے ہمیشہ کیلئے شعر گوئی کو ترک دینے کی قسم کھالی، حضرت عمر الفاروق رضؓ اور حضرت اسید بن حضیر رضؓ کے قبولِ اسلام کے واقعات بھی تاریخ کا ایک حصہ ہیں، یہ حضرات اسلام دشمنی میں چور، ننگی تلوار کے ساتھ اس کی بیخ کنی کیلئے نکلے مگر اس ادبِ عالی کی قدرتی تاثیر نے انہیں ہمیشہ کے لئے اپنا اسیر بنا لیا، کل تک جو اس کے دشمن تھے اب وہ محافظ بن چکے تھے۔

قرآن مجید کا یہ کھلا ہوا اعلان ہے کہ یہ عربی زبان میں نازل ہوا جو اس کے اولین مخاطب کی زبان تھی، عربوں کے ہی اسالیب اور تعبیرات کو اپنایا اور ان کی معاشرتی اور ادبی بنیادوں پر شریعتِ اسلامی کے احکام و تعلیمات کی بنیاد رکھی، اسالیبِ قرآن کا مطالعہ کرنے والوں کو یہ بات اچھی طرح معلوم ہے کہ اس کے اسالیب، استعارات اور تعبیرات ان اصول و ضوابط کے عین مطابق ہیں جو اس کے نزول کے وقت رائج اور مقبول تھے، اسی وجہ سے تمام مفسرین نے بالاتفاق فہمِ قرآن کی اولین شرطوں میں اس ادب سے واقفیت کو رکھا ہے۔ بلکہ بعض نے تو ان کے ادبی ذوق و رجحانات کے

علاوہ ان کی معاشرت سے مکمل واقفیت کو بھی ضروری قرار دیا ہے[1]۔ اس کی ضرورت بعض دفعہ حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی محسوس کی، اور متعدد بار مشکل مواقع پر اس کی جانب رجوع کیا[2]، نیز اس کی طرف رغبت دلائی، غالباً انہی اسباب کی بنا پر جاہلی ادب کے بچے کھچے سرمایہ کو پہلی فرصت میں محفوظ کرنے کی کوشش کی گئی، اور اس کی تمام تر سفاہت و فحاشی کے باوجود محض فہم قرآن کا وسیلہ ہونے کی وجہ سے پڑھنے پڑھانے کی ہمیشہ ترغیب دی جاتی رہی، ڈاکٹر طٰہٰ حسین اور ان کے ہمنوا بعض مستشرقین نے جب اس کے اعتبار کو مشکوک کرنے کی کوشش کی تو اس کا دنداں شکن جواب دیا گیا، اور اس کی اہمیت کو کسی طرح کم نہ ہونے دیا گیا[3]۔

تفسیر نویسی کا آغاز ہوا تب بھی سب سے پہلے قرآن مجید کے لسانیاتی پہلو پر توجہ دی گئی، اور دیکھتے ہی دیکھتے لغات القرآن اور اعجاز القرآن کے موضوع پر کتاب نویسی کا ایک طویل سلسلہ ہو گیا، غرائب القرآن معانی القرآن، قرأت القرآن جیسے موضوعات پر کتابیں اس پر مستزاد ہیں، قرآنیات کے اس پہلو پر کتابوں کا اتنا بڑا ذخیرہ تیار ہو گیا کہ ان کا شمار میں لانا مشکل ہو گیا، علامہ سیوطیؒ نے نویں صدی ہجری ہی میں اپنے عجز کا اظہار کر دیا تھا، اس نوعیت کی کتابوں کی ایک منتخب فہرست مضامین کے لحاظ سے ذیل میں درج کی جا رہی ہے، جس سے قدماء کی گراں قدر خدمات کا کسی حد تک اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

لغات القرآن:

بصائر ذوی التمییز فی لطائف الکتاب العزیز: مجد الدین فیروز آبادی

الجامع الوجیز الخادم للغات القرآن العزیز: محمد بن یوسف بن علی الشامی (متوفی ۱۵۳۶ء)

رسالۃ جلیلۃ تتضمن ما ورد فی القرآن الکریم من لغات القبائل: ابو عبید القاسم بن سلام (م ۲۲۴ھ)

الزینۃ فی الکلمات الاسلامیۃ العربیۃ، ابو حاتم الرازی (م ۳۲۲ھ)

---

[1] تدبر قرآن ۱/ ۱۲-۱۷ [2] محمد حسین الذہبی، التفسیر والمفسرون ۱/ ۵۷-۵۸

[3] مصادر الشعر الجاہلی، ناصر الدین اسد، دار المعارف، طبع پنجم، مصر ۱۹۷۸ء

سبيكة الذهب الابريز في فهرس مقاصد الكتاب العزيز في اللغات القرآنية

شذوذ الابريز في لغات الكتاب العزيز : محمد بن القادر بن احمد اليمني (م ١٠١٥ هـ)

شموس العرفان بلغة القرآن ، ابو السعود عباس

قانون الهي في ترجمة لغات القرآن الشريف : عبد المجيد بن عز الدين بن ملك الحنفي

كتاب اللغات في القرآن : عبد الله بن الحسين (م ٣٨٦ هـ)

اللغات : الفراء (م ٢٠٧ هـ)

لغات القرآن : سعيد بن اوس بن ثابت الانصاري (م ٢١٥ هـ)

لغات القرآن : عبد الرشيد نعماني / عبد الدائم (اردو)

لغات القرآن : هيثم عدي (م ٢٠٧ هـ)

المحيط بلغات القرآن : احمد بن علي بن محمد البيهقي (م ٥٣٣ هـ)

مفردات القرآن : عبد الحميد الفراهي (م ١٣٤٩ هـ)

المفردات في غريب القرآن ، راغب اصفهاني (م ١١٠٨ م)

معجم القرآن : غلام جيلاني برق .

نزهة الخاطر وسرور الناظر في بيان لغات القرآن : فخر الدين بن محمد بن علي الطريحي (م ١٠٧٤ هـ)

اعجاز القرآن :

اعجاز القرآن والبلاغة النبوية : مصطفى صادق الرافعي (م ١٩٣٧ م)

اعجاز القرآن في مفهوم جديد : عبد الكريم الخطيب

اعجاز القرآن : ابو بكر الباقلاني (م ٤٠٣ هـ)

اعجاز القرآن : عبد القاهر جرجاني (م ٤٧١ هـ)

الاعجاز فى نظم القرآن : محمود السيد شيخون ،

الاعجاز البيانى للقرآن : عائشة بنت الشاطى

بديع القرآن : عبد العظيم بن عبد الواحد بن ابى الاصبع البغدادى (م ٦٥٦ هـ)

البديع فى ضوء اساليب القرآن : عبد الفتاح لاشين

بلاغة القرآن بين الفن والتاريخ ، فتحى احمد عامر

بيان اعجاز القرآن : ابراهيم الخطابى (م ٣٨٨ هـ)

تاريخ فكرة اعجاز القرآن منذ البعثة النبوية حتى عصرنا الحاضر ، نعيم الحمصى (باحثات)

فنون البلاغة بين القرآن وكلام العرب : فتحى عبد القادر فريد

النكت فى اعجاز القرآن ، ابو الحسن عيسى الرمانى (م ٣٨٣ هـ)

غرائب القرآن :

الاريب بما فى القرآن من الغريب ، ابن الجوزى (م ٥٩٧ هـ)

الاشباه والنظائر : ابو منصور الثعالبى (م ٤٢٩ هـ)

الاشباه والنظائر : جلال السيوطى (م ٩١١ هـ)

تحفة الاريب بما فى القرآن من الغريب : ابو حيان النحوى (م ٧٤٥ هـ)

تفسير غريب القرآن : ابن قتيبة الدينورى (م ٢٧٦ هـ)

العمدة فى غريب القرآن ، مكى بن ابى طالب (م ٤٣٧ هـ)

غريب القرآن : محمد بن سلام الجمحى (م ٢٣١ هـ)

غريب القرآن : ابن جرير الطبرى (م ٣١٠ هـ)

معانى القرآن : الاخفش الاوسط (م ٢١٥) الزجاج (م ٣١١ هـ) ابو جعفر النحاس (م ٣٣٨ هـ)

اس فہرست پر ایک طائرانہ نظر ڈالنے سے ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ موضوع زیر بحث پر بڑے بڑے
آئمہ فن نے قلم اٹھایا اور اس کی مختلف جہتوں پر گراں قدر سرمایہ چھوڑا، تاہم موضوع کی اہمیت اپنی جگہ باقی
اور اس کے بعض پہلو ہنوز تشنۂ تکمیل معلوم ہوتے ہیں، بالخصوص ادب جاہلی کا اس حیثیت سے مطالعہ کہ
وہ فہم قرآن میں کس حد تک معاون ثابت ہو سکتا ہے، اولین کے یہاں اس کا کیا مقام و مرتبہ ہے
اور مفسرین نے اپنی تفاسیر میں کس حد تک اسے برتا ہے، یا یہ معاملہ کہ خود قرآن نے اس ادب
کو اپنے استدلال میں لا کر تیئس ۲۳ سال کی قلیل مدت میں کتنے اوپر اٹھا دیا ہے، بالخصوص درجنوں
کی تعداد میں اصطلاح سازی اور انہیں مقبول عام بنا کر کتنا عظیم کارنامہ انجام دیا ہے۔

اس کمی کی جانب سب سے پہلے ہمارے ان اساتذہ کرام نے توجہ دلائی جو ادارۂ علمی و تحقیقات اسلامی
علی گڑھ، میں قرآن مجید کے تعلیم و تدریس کے فرائض پر مامور ہیں، اللہ تعالیٰ نے جب اپنے فضل
و کرم سے عربی ادب میں بالترجیح تحقیق کرنے کی توفیق بخشی تو سب سے پہلے عربی ادب کی شاہکار
کتاب قرآن مجید کی طرف نظر اٹھی، اور جب موضوع کے انتخاب کا مرحلہ آیا تو فوراً اپنے لائق
اساتذہ کی نصیحتیں یاد آئیں، چنانچہ الشد کا نام لے کر "قرآنی اصطلاحات کا ان کے بنیادی مآخذ
کی روشنی میں تنقیدی مطالعہ" برائے ایم فل اور "فہم قرآن میں ادب جاہلی کی معنویت" برائے پی ایچ ڈی
جیسے موضوعات کے ساتھ شعبہ عربی، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، میں درخواست گذار دی، مقام مسرت
ہے کہ ہمارے مشفق اساتذہ نے انہیں لائق اعتنا سمجھا، اور شرف قبولیت بخشا۔ اس طرح
تحقیق و جستجو کے تجربہ کے ساتھ ایک دیرینہ آرزو کی تکمیل کرنے اور ساتھ ہی کچھ توشۂ آخرت تیار
کرنے کا بہترین موقع نصیب ہوا، اللھم لک الحمد ولک الشکر۔

اس رسالہ میں مقدمہ کے علاوہ دو باب ہیں، باب اول کی حیثیت تمہید کی ہے جس میں
زبان و بیان کی تدریجی تاریخ، تغیرات کے اسباب و مظاہر، ارتقائی مراحل، اصطلاح سازی کے

پس منظر اور ان کے وجود میں آنے کے طریقہ پر مختصراً بحث کی گئی ہے، تاکہ اصطلاحات کا تجزیہ کرتے وقت اس کی ابتدائی شکل آئینہ کی طرح واضح رہے، اور دوسرے باب میں اصطلاحاتِ قرآن کو عقیدہ، عبادت اور رشد و ہدایت کے عنوان سے تقسیم کر کے بنیادی ماخذ کی روشنی میں ان کا تنقیدی مطالعہ کیا گیا ہے۔

ہمارے مطالعے کا طریقہ یہ رہا ہے کہ پہلے لفظ (اصطلاح) کے مادہ و مصدر کے حوالے سے اس کے اصلی (بنیادی) معنی پر غور کیا جائے، جیسا کہ ائمہ لغت نے اپنی تصانیف میں بالعموم کیا ہے، پھر یہ لفظ کلام عرب میں کس طرح استعمال ہوتا رہا ہے، جاہلی ادب کے بنیادی مصادر سے ان کی وضاحت کی گئی ہے، اس کے بعد یہ دکھایا گیا ہے کہ قرآن مجید نے مذکورہ لفظ کو کیسے اپنایا، کس کس طرح سے استعمال کیا، اصطلاح کا درجہ اسے کب حاصل ہوا، اور آخر میں یہ کہ اس اصطلاح کا صحیح مفہوم کیا ہے۔

اس مطالعہ کے نتیجہ میں یہ دلچسپ پہلو سامنے آیا کہ اصطلاح سازی بجائے خود قرآن کا مقصد نہیں تھا، بلکہ ایک نئے عہد کے آغاز اور ایک نئی شریعت کی تفہیم کے ضمن میں وہ خود بخود وجود میں آتی چلی گئیں۔ چنانچہ جو اصطلاحات ہمارے مطالعہ میں آئیں، ان کی درج ذیل قسمیں کی جا سکتی ہیں۔

(۱) بعض قرآنی اصطلاحات بعینہٖ اسی مفہوم میں استعمال ہوئیں جس میں کہ وہ زمانہ جاہلیت میں رائج و مقبول تھیں۔

(۲) بعض اصطلاحات میں قرآن مجید نے گزشتہ مفہوم کو باقی رکھتے ہوئے اس کے دائرہ کار کو مزید وسیع کیا گیا ہے۔

(۳) کچھ الفاظ کلام عرب میں بطور اصطلاح استعمال ہوتے رہے ہیں، قرآن مجید نے بھی انہیں اصطلاح کا درجہ دیا ہے، لیکن اس کا مفہوم بالکل الگ بیان کیا ہے

(۴) کلام عرب میں صرف لغوی معنی میں مستعمل تھا، لیکن قرآن نے اصطلاح کا درجہ دیا، اس سے عربی ادب کی اصطلاحات میں بیش بہا اضافہ ہوا۔

(۵) بعض اصطلاحات ایسی بھی ہیں، جو مخصوص لفظ کے ساتھ قرآن مجید میں وارد نہیں ہوئی ہیں، لیکن وہ تصریحات قرآن ہی سے ماخوذ و مستنبط ہیں، مثلاً توحید وغیرہ۔

مقالہ میں ہر طرح کی اصطلاحات کو شامل کرنے کی کوشش کی گئی ہے، اور موقع پر ہی نوعیت کی وضاحت کر دی گئی ہے، ہماری خواہش یہ رہی ہے کہ زیادہ سے زیادہ اصطلاحات کو تحقیق کے دائرہ میں لایا جائے، مگر اصطلاحات کی تعیین اور تلاش بجائے خود بہت مشکل کام ہے اور افسوس کی بات یہ ہے کہ زیادہ تر ماخذ اس سلسلے میں خاموش ہیں۔ اس لئے استقصاء کا دعویٰ کرنا صحیح نہیں ہے، البتہ ہم اس بات کے بے حد متمنی ہیں کہ مزید اصطلاحات کی نشاندہی ہو، تاکہ اس تحقیق کے دائرہ کار کو وسیع تر کیا جا سکے۔

مقالہ کی آخری سطریں لکھتے وقت آج ہمارا دل تشکر و امتنان کے جذبات سے لبریز ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے کتاب عزیز کی خدمت کی توفیق بخشی، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ کام بہت نازک اور مشکل تھا، اس کی تکمیل میں ہمارے مشفق استاذ پروفیسر عبد الباری (سابق صدر شعبہ) کی توجہات و عنایات کا خاص حصہ ہے، موصوف نے موضوع کی منظوری سے لے کر آخری سطروں کی تحریر تک تحقیقی پیش رفت میں دستگیری فرمائی اور بوقت ضرورت ہر طرح کا تعاون پیش کیا۔ صدر شعبہ عربی پروفیسر محمد راشد ندوی صاحب نے بار بار اس کی تکمیل کی جانب توجہ دلائی، اور مشکل مراحل میں راہنمائی فرمائی، برادر بزرگوار ڈاکٹر ظفر اللہ سلام اصلاحی، ڈاکٹر ابو سفیان اصلاحی، اور ڈاکٹر سفیان احمد فلاحی صاحبان نے تاخذ کی فراہمی میں بڑی مدد کی، ادارہ علوم القرآن اور شعبہ عربی و اسلامیات کی لائبریریوں سے زیادہ تر مواد حاصل کیا، لائبریری کے اہل کار

بالخصوص کبیر احمد خان اور محمد یوسف خان صاحبان کے پرخلوص تعاون سے بڑا ممنون ہوں۔ میں اپنے تمام ہی محسنین و معاونین کا تہہ دل سے شکر گذار ہوں، اور دعاگو ہوں کہ اللہ تعالیٰ اس حقیر خدمت کو قبول فرمائے، اور تمام مخلصین و معاونین کیلئے اسے صدقہ جاریہ بنائے۔ آمین۔ ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم۔

عبدالمتین

باب اوّل

قرآنی اصطلاحات: ابتدا و ارتقاء

لغت میں تبدیلی وارتقاء کی روایت : زبان میں تغیر وارتقاء ایک فطری امر ہے، جس طرح خود انسانی زندگی ہمیشہ تغیر پذیر ہوتی ہے اور کبھی اس میں ٹھہراؤ نہیں آتا، اسی طرح زبان وادب میں بھی برابر تغیر واقع ہوتا رہتا ہے، یہ تغیر کبھی لہجہ اور آواز میں ہوتا ہے، کبھی الفاظ کی ہیئت میں اور کبھی معانی کی کمی و زیادتی کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے، تغیر کی یہ روایت حیاۃ انسانی کے تغیرات کے ساتھ ساتھ چلتی ہے، اور اس کے پیچھے بھی ایسے ہی سماجی، سیاسی، معاشی اور اخلاقی عوامل کارفرما ہوتے ہیں جن کی وجہ سے مرور زمانہ کے ساتھ حیاۃ انسانی تغیر پذیر رہتی ہے، ماہرین لسانیات نے ان کے اسباب وعوامل کا تفصیل سے جائزہ لیا ہے، اور اس سلسلے کے بہت سے رازہائے سربستہ منظر عام پر لانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر علی عبدالواحد وافی نے لسانیاتی تغیرات کے اسباب وعوامل کا گہرائی سے تجزیہ کرکے چار بڑے عوامل کی نشاندہی کی ہے۔

(۱) زبان کا پہلے کے لوگوں سے بعد کے لوگوں کی جانب منتقل ہونا

(۲) ایک زبان کا دوسری زبانوں سے متاثر ہونا،

(۳) بہت سے نفسیاتی، اجتماعی، اور جغرافیائی عوامل بھی ہیں جو تغیرات کا سبب بنتے ہیں، مثلاً قومی ثقافت، سماجی نظام، مذہبی معتقدات، فکری میلانات اور جغرافیائی ہیئت وغیرہ۔

(۴) ادبی عوامل جو بولنے والے کے جذبات، تعلیمی ادارے، اور لسانیاتی تحریکوں اور اکیڈمیوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔[۱]

لغویین نے اس کے علاوہ بھی بعض عوامل کی نشاندہی کی ہے، مگر واقعہ یہ ہے کہ وہ مذکورہ عوامل کے ذیلی عناوین کا درجہ رکھتے ہیں۔

---

[۱] علی عبدالواحد وافی، علم اللغۃ ص ۲۴۹

جب کوئی شخص عربی ادب کی تاریخ اور اہل عرب کے حالات کا گہرائی سے تجزیہ کرتا ہے تو بہت سے اسباب و عوامل خود بخود ذہن میں نقش ہو جاتے ہیں۔ دورِ جاہلیت میں ہر قبیلہ کی اپنی الگ زبان، لہجہ، تہذیب اور اقدار ہوتی تھیں، اس وقت کے قبائلی نظام میں باہم حلیف و دوست بننے کی روایت تھی، اور زبردست رسہ کشی ہوتی تھی، کبھی زبان و ادب اور مذہب و ثقافت کے نام پر ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو جاتے اور کبھی دشمنی شخصی تو صرف "نمک" لینے کی باتیں ہوتیں۔ غرض انہیں باہم دگر ہونے کے بہت سے مواقع ملتے، اور اس تعدد فی طرفین کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا کہ ایک دوسرے کے معمولات، نظم و نسق، ادب و ثقافت اور غور و فکر کے طریقوں سے سب کو واقفیت ہوتی رہتی تھی، بالخصوص ان کے ادبی معرکوں اور دینی، سماجی اور تجارتی تقریبات نے ایک دوسرے سے بہت قریب کر دیا تھا، اور ان کی مخصوص زبانوں اور لہجات کو باہم اثر پذیر ہونے یا اثر قبول کرنے میں غیر معمولی کردار ادا کیا ہے، عکاظ کا میلہ اور اس کی تقریبات تاریخ ادب عربی کا ایک اہم سنگ میل ہے، جزیرۃ العرب کے علاوہ شام، عراق اور یمن کے لوگ بھی طویل سفر طے کر کے اس میں شریک ہوتے، اور اس کے مطابق اہل حجاز ان کا استقبال اور ضیافت کرتے، یہاں بالکل قریب سے ایک دوسرے کے معمولات کا مشاہدہ ہوتا، ان کے معتقدات اور تہذیبی قدروں کو سمجھنے کا موقع ملتا، شعراء و خطباء اپنی صلاحیت لسانی اور تخلیقی صلاحیتوں کا مظاہرہ کرتے، یہ تقریبات ہر سال تسلسل کے ساتھ ہوتیں اور اپنے دور رس اثرات مرتب کرتیں۔

ماہرین لغت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ قرآن مجید اسی مشترک زبان اور متعدد لہجہ پر نازل ہوا ہے جو نزول قرآن سے قبل صدہا سال میل جول کی وجہ سے معرض وجود میں آگیا تھا، قبیلہ قریش کو ان تقریبات کی میزبانی اور خانہ کعبہ کی تولیت کا شرف حاصل تھا، اس لئے وہ دیگر قبائل کے بالمقابل یک گونہ فضیلت رکھتا تھا، پھر اس کا لہجہ و زبان بھی نسبتہً شگفتہ و آسان تھا اور دوسرے

قبائل کے آسان، خوبصورت اور قابل قبول الفاظ کو اپنے اندر سمو لیتے تھے، اس لیے قبیلہ قریش کی زبان اور لہجہ کو متفقہ طور پر معیاری (Standard) قرار دیا گیا، حسن اتفاق سے ان سرگرمیوں میں زیادہ تیزی زمانہ نزول قرآن سے متصل پیدا ہوئیں، قرآن نے اس ارتقائی سفر کو بام عروج پر پہونچا دیا اور ہمیشہ کیلئے قریش کی زبان اور لہجہ کو دنیا کیلئے نمونہ بنا دیا۔

جیسا کہ اوپر ذکر آیا زبانوں کے تغیر و ارتقاء میں حیاۃ الانسانی کے انقلابات و تغیرات کا بڑا دخل ہوتا ہے، عہد جاہلی کا ایک مخصوص طرز زندگی تھا، مخصوص ثقافت اور مخصوص تہذیب تھی لیکن جب معجز نما کتاب قرآن مجید نازل ہوئی تو اس نے معمولات زندگی میں ایک ہنگامہ برپا کر دیا زبان بدلی، تہذیب بدلی، رہائش و بود و باش کے طور طریق بدلے، یہاں تک کہ سوچنے اور برتنے کے انداز بھی بدل گئے، سب سے زیادہ تبدیلیاں الفاظ کے معانی و مفہوم میں رونما ہوئیں، اب تک وہاں کے شعر و ادب کو ان کے معمولات، اخلاق و عادات، قبائلی نظم و نسق، دینی امور اور عرب سے متعلق سب سے بڑا نمائندہ سمجھا جاتا رہا ہے۔ قرآن مجید جو ایک عظیم انقلاب کا اصل محرک اور عامل ہے جب اس کا نزول شروع ہوا تو بجا طور پر یہ توقع کی گئی کہ اس نے جو اسلوب استعمال کیا ہے ترقی یافتہ اور انقلاب آفریں ہو، کیونکہ لغت ہی وہ بنیادی عامل ہے جو ہر طبقے کے لوگوں کے طرز زندگی اور روزمرہ کے معمولات کا ترجمان ہوتی ہے،

یہ ایک حیرت ناک بات ہے کہ عصر جاہلی اور زمانہ نزول قرآن کے درمیان کوئی لمبا وقفہ نہیں ہے، بلکہ دونوں زمانے بالکل ملے ہوئے ہیں، اس قلیل مدت میں دونوں زمانوں کی اقدار و روایات، زبان و اسلوب بیان میں غیر معمولی تبدیلیاں رونما ہوئیں، بلکہ الفاظ کے معانی کا دامن تنگ ہو گیا اور بعض کا بہت وسیع، اور بعض نے تو بالکل ہی نیا روپ اختیار کر لیا، اور سیکڑوں الفاظ ایسے بھی ہیں جو اپنے قدیم روایتی معانی کھو کر نئے معمولات اور مفاہیم کے ساتھ متعارف

ہوئے۔ اور یہ سب کچھ محض چند برسوں میں انجام پا گیا، جب لسانی ارتقاء کی تاریخ جاننے والوں سے یہ بات مخفی نہیں کہ زبانوں میں تغیر و ارتقاء بہت دھیمی رفتار میں غیر محسوس طریقہ سے بتدریج ہوتا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر عصر جاہلی اور عصر قرآن کے درمیان اتنا مختصر وقفہ ہونے کے باوجود کیونکر ایسا زبردست تغیر واقع ہوا، آخر اس کے پیچھے کیا راز پنہاں ہیں، اور اس کے اسباب و محرکات کیا ہیں، اس موقع پر ان کی تحقیق و جستجو بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگی۔

قرآن مجید کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ "عربی مبین" میں نازل ہوا، قرآن کی یہ تعبیر ایسی جامع اور بلیغ ہے کہ اس کے اصل مفہوم کے ادراک ہی سے اس کے تمام رازہائے سربستہ فاش ہو جاتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کے ذریعہ پوری دنیا کے اور ہر زمانے کے لوگوں کو مخاطب کیا ہے، اور عربی داں حضرات کو اس کی تبلیغ و اشاعت کا مکلف بنایا ہے، اس وجہ سے حکمت عملی اس بات کی متقاضی ہوئی کہ قرآن کی زبان دور جاہلیت کی معیاری زبان سے مناسبت کے ساتھ ساتھ خود اپنے اندر نئے معانی و مفاہیم کی ادائیگی کیلئے تبدیلیاں قبول کرنے کی بدرجہ اتم صلاحیت رکھتی ہو، یہی وجہ ہے کہ جب پہلی بار قرآن کی صدا اہل عرب کے کانوں سے ٹکرائی تو باوجودیکہ وہ انہی کے زبان و اسلوب میں نازل ہوا تھا وہ دم بخود رہ گئے، پھر بعثت قرآن کی یہ تاثیر ہر زمانے میں اور ہر جگہ کے لوگوں کے لئے باعث حیرت و استعجاب بنی رہی۔

"عربی مبین" کا یہی حقیقی مفہوم ہے کہ وہ زمانے کے انقلابات، زبانوں کے تغیرات اور روزمرہ کے معمولات میں بہت زیادہ فرق آجانے کے باوجود ہر شخص کیلئے واضح، آسان اور زندہ و تابندہ ہے، اس درمیان نامعلوم کتنی زبانیں معرض وجود میں آئیں اور نابود ہوگئیں، مگر قرآن کی زبان ہے کہ اس کے الفاظ و معانی کے لب و لہجہ، انداز و اسلوب بیان تازگی و طراوت کسی میں ادنیٰ فرق بھی واقع نہیں ہوا، بلکہ اس نے عربی زبان کو زندہ جاوید

بنا کر وہ فروغ بخشا کہ لغات کی دنیا میں اتنی طویل زندگی اور مقبولیت شاید ہی کسی کو نصیب ہوئی ہو، دنیا کے تمام ممالک میں عربی بولنے اور سمجھنے والے لوگ اچھی خاصی تعداد میں موجود ہیں، اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ قرآن مجید نے جن الفاظ و اسالیب کا انتخاب کیا وہ عصر جاہلی کی زبان و اسلوب سے گہری مناسبت کے باوجود اپنے اندر ہمیشہ کیلئے ارتقاء پذیر رہنے اور قابل قبول ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

یہاں ایک بڑا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ زبانوں میں تغیر بہت ہی دھیمی اور غیر محسوس رفتار میں بتدریج ہوتا ہے اور اس کے پیچھے کچھ فطری عوامل کارفرما ہوتے ہیں، اور ان کا اندازہ بھی عرصہ دراز کے بعد ہو پاتا ہے پھر کیا وجہ ہے کہ قرآن نے اپنی مختصر سی تاریخ میں اتنا زبردست انقلاب برپا کر دیا، کیا یہ سب کچھ منجانب اللہ معجزاتی طور پر ہو گیا ہے، یا اس کے بھی کچھ فطری اسباب و عوامل ہیں۔ اس کا اجمالی جواب تو یہ ہے کہ یہ سب کائناتی روایات کے عین مطابق اور فطری محرکات کی بنا پر ہوا ہے۔

اس اجمال کی تفصیل بیان کرنے میں ایک بار پھر تاریخ ادب عربی کے ان کلمات کا حوالہ دینا مناسب معلوم ہوتا ہے جبکہ مہبط وحی شہر مکہ تمام ادبی، علمی، سیاسی اور مذہبی سرگرمیوں کا مرکز بنا ہوا تھا، اور بڑے بڑے علمی و ادبی معرکے بپا ہو رہے تھے، جس کے نتیجے میں اہل زبان خود بخود ایک مرکزی اور معیاری زبان کی طرف بتدریج بڑھ رہے تھے۔ قبیلہ قریش کی زبان و لہجہ میں ایسی خصوصیات پہلے سے موجود تھیں کہ اس کو معیاری مان کر دوسرے لہجات کو اس میں ضم کر دیا جاتا، چنانچہ یہ کوشش جاری ہی تھی کہ نزول قرآن کا سلسلہ شروع ہو گیا، اور اس نے اس ارتقائی عمل کو تیزی سے مکمل کر دیا۔ پھر اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ قرآن مجید نے جو بنیادی بیان کی ہیں وہ اس لحاظ سے زیادہ اہم نہیں ہیں کہ ان میں سے زیادہ تر کا تعلق محض تہذیب و

نگہداری ہے، قرآن مجید نے الفاظ کی بنیادی ہیئت اور بنیادی معانی کو اپنی جگہ باقی رکھتے ہوئے ان میں مزید سلاست و روانی یا معنوی وسعت و پختگی بخشی ہے۔ جہاں تک اصطلاحات کا تعلق ہے، تو اس کی اپنی الگ تاریخ ہے، اصطلاحات ہمیشہ نئے علم و فن اور نئے افکار و نظریات کے ساتھ وجود میں آتی ہیں، کیونکہ یہ ان کی بنیادی ضروریات میں شامل ہیں، قرآن ایک حقیقی دین، ابدی شریعت، روحانی پیغام اور نئی دعوت لیکر آیا تھا، اس کا حلقہ دعوت بہت وسیع اور اس کی مدت کا لامتناہی ہے۔ اس لیے یہ فطری امر ہے کہ وہ اپنے ساتھ ایسے عوامل و محرکات بھی ساتھ لایا جو اس کے مقاصد کے حصول کیلئے ناگزیر تھے۔

اس تحقیقی کاوش کا مقصد زبان کے تغیراتی مراحل کا جائزہ لینا ہے، اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر اس کی بنیادی ہیئت میں تبدیلیوں کے اسباب بھی معلوم کرنے کی کوشش کی جائے

زبانوں میں تغیر بالعموم دو طرح کے ہوتے ہیں، صوتی تغیر یعنی لب و لہجہ میں تبدیلی اور دلالتی تغیر یعنی معنوی تبدیلی۔ اور دلچسپ بات یہ ہے کہ یہی دونوں مظاہر ایک دوسرے کے پائے جانے کا سبب بھی ہیں، مندرجہ ذیل سطروں میں ان دونوں مظاہر کا جائزہ پیش کیا جا رہا ہے، اور آخر میں ان بڑے لغوی مظاہر کو بھی پیش کیا جائیگا جس کی تکوین میں دونوں مشترک ہیں۔

صوتی تغیرات اور اس کے مظاہر: ۱۔ صوتی تغیر کا سب سے بڑا سبب مختلف علاقوں میں روزمرہ کی گفتگو یا بول چال ہے، اکثر ایسا ہوتا ہے کہ حروف کا حرکات کا صحیح تلفظ بولنے، سننے یا دہرانے میں غلطی ہو جاتی ہے، چونکہ بات روزمرہ کے معمولات کی ہے اس لیے اس کا رواج بھی بہت جلد ہو جاتا ہے، اور معاشرہ میں یہ غلطی ایسی راہ پا جاتی ہے کہ وہی اصل کی قائم مقام

بن جاتی ہے اور بدلے ہوئے تلفظ اور اصل کے درمیان فرق کرنا مشکل ہو جاتا ہے اور بالخصوص بچوں کے معاملہ میں ایسا بہت زیادہ ہوتا ہے۔

۲۔ اس کا دوسرا سبب لہجہ و آواز کی "نقل" کرنے کا جذبہ ہے، زبان دانی کا شوق ہر زمانے میں برابر پایا جاتا رہا ہے۔ آدمی چاہتا ہے کہ وہ ایک سے زیادہ زبانیں سمجھنے اور بولنے پر قادر ہو۔ چنانچہ اسے جب کوئی موقع ہاتھ آتا ہے فوراً اس کی "نقالی" شروع کر دیتا ہے، عربی زبان میں چونکہ یہ دوہری خصوصیت موجود ہے کہ اس میں درجنوں قبائلی و مقامی زبانیں پائی جاتی ہیں، اور وہ نئے الفاظ و لہجات کو قبول کرنے کی غیر معمولی صلاحیت رکھتی ہے۔ اس لئے دوسری زبانوں سے استفادہ کا رجحان یہاں کچھ زیادہ ہی پایا جاتا رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ کسی دوسری زبان کو اس کے لہجہ اور آواز میں بول لینا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اس لئے نقل کرنے والے عام طور پر صحیح رنگ و آہنگ نہیں اختیار کر پاتے۔ اور غلطیوں پر غلطیاں کرتے جاتے ہیں۔ پھر الفاظ کے مخارج اور آواز بتدریج اس لہجہ و آواز سے قریب ہونے لگتی ہے جو نقل کرنے والوں کے ماحول میں جاری و مقبول ہوتی ہے۔ اور اس سے الفاظ کی ایک نئی شکل پیدا ہو جاتی ہے جو الفاظ کے حقیقی لہجہ و تلفظ سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔

۳۔ صوتی تغیرات کے اسباب میں ایک سبب قیاس خاطی بھی ہے، قیاس خاطی کا مطلب یہ ہے کہ لغت میں مشہور و مروج اصول کے مطابق صوتی آہنگی کی وجہ سے کوئی نیا معنی رائج ہو جائے، اس اصول کو عتید اور عتیق کے الفاظ سے سمجھا جاتا ہے، یہ دونوں لفظ قرآن مجید میں دو بار آئے ہیں، عتید کے معنی دونوں مقامات پر حاضر و موجود کے ہیں (ق: ۱۸، ۲۳) جیسا کہ قدیم اشعار میں ہیں، اور عتیق کے معنی قدیم و پرانے کے ہیں (الحج: ۲۹، ۳۳) جدید عربی ادب میں عتید بھی عتیق کے معنی میں استعمال ہونے لگا، اور عوام میں مقبول ہو گیا۔ ایسے تغیرات کو لغوی

"قیاس خاطی" سے تعبیر کرتے ہیں، اور اسے ارتقاء لغت کے اصول میں شامل کر لیا گیا ہے[1]

۴۔ یہ نظریہ سہولت بھی بعض آوازوں / تلفظ کے ارتقاء میں عمل پذیر ہوتا ہے، یہ نظریہ بتاتا ہے کہ لغت اپنے ارتقاء کے مراحل میں سہولت اور آسانی کی جانب ہمیشہ مائل رہتی ہے، تاکہ ثقیل آوازوں کو زیادہ سے زیادہ نرم لب و لہجہ میں بدلا جا سکے۔

۵۔ بعض مفردات میں معنوی ارتقاء ہی صوتی ارتقاء کا بھی سبب بن جاتا ہے۔

معنوی ارتقاء۔ عوامل و مظاہر: معنوی ارتقاء کو ابتدائی طور پر تین خانوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

۱۔ قواعد کا ارتقاء: جس کا تعلق الفاظ، جملوں کی ترکیب اور عبارت سے ہوتا ہے، جیسے اشتقاق اور نحو و صرف کے قواعد۔

۲۔ اسلوب کا ارتقاء

۳۔ نفس معنی کا ارتقاء: یہ ارتقاء مختلف شکلوں میں ظاہر ہوتا ہے۔

معنوی ارتقاء کے عوامل: معنوی ارتقاء کے عوامل بہت زیادہ ہیں، چند ایک کو یہاں خصوصیت کے ساتھ بیان کیا جا رہا ہے جو زیادہ اہم ہیں۔

۱۔ وہ عوامل جن کا تعلق کلمات کے استعمال سے ہوتا ہے، کیونکہ کلمہ کے معنی ان حادثات کے تحت تبدیل ہو جاتے ہیں، جن میں ان کا استعمال زیادہ ہوتا ہے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ عام الفاظ حادثات و زمانہ کی رعایت سے مخصوص معنی میں استعمال ہونے لگتے ہیں، اور پھر ان کا مدلول محدود ہو کر رہ جاتا ہے، جیسے علمی و فنی اصطلاحات، اور اس کے بالکل برعکس کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ معانی کے اختصاص کا حصار ٹوٹ جاتا ہے، اور وہ زمانہ تک ایک مخصوص معنی میں استعمال ہوتے رہنے کے باوجود عام معنوں میں استعمال ہونے لگتا ہے۔ مثال کے طور پر البأس، المورد

---

[1] لحن العامہ والتطور اللغوی ۲۲-۲۳؛

اور الرائد وغیرہ ہیں، الباس اسلحہ جنگ کیلئے مخصوص تھا، پھر اس کا استعمال ہر طرح کی شدت و پریشانی کیلئے ہونے لگا، "الورد" صرف پانی گرنے کیلئے مخصوص تھا پھر ہر چیز کے آجانے جانے کے لئے بولا جانے لگا، اسی طرح الرائد گھاس اور چارہ کے متلاشی کو کہتے تھے، مگر بعد میں یہ ہر طرح کی ضروریات کے فراہم کیلئے بولا جانے لگا۔

۲۔ الفاظ کے حقیقی معانی سے مجازی معانی کی طرف منتقلی کی وجہ سے معانی میں تغیر واقع ہوجاتا ہے، اور کبھی کبھی یہ تغیر اتنا غیر معمولی ہوتا ہے کہ اسی پر اصل کا گمان ہونے لگتا ہے، حالانکہ بالارادہ لفظ تغیر معنی کیلئے وضع نہیں ہوا تھا، اس کی مثال "الغفر" اور "العقیقۃ" کے الفاظ ہیں، "غفر" کے معنی "ڈھانکنا" یا "ڈھکن" کے تھے، مگر مجازی طور پر یہ لفظ گناہوں کے ڈھانکنے / کی معافی کیلئے استعمال ہونے لگا، اسی طرح العقیقہ کے بنیادی معنی اس بال کے ہیں جو نومولود جسم پر پیدائش کے وقت ہوتا ہے، عقیقہ کے وقت چونکہ یہ بال تراشا جاتا ہے اس لئے عقیقہ اس بال کے بجائے اس عبادت کیلئے ہونے لگا، جو نومولود کے نام پر جانور ذبح کرکے ادا کی جاتی ہے۔

۳۔ معنوی تغیر کے سلسلے میں عام طور سے اس معنی پر زیادہ اعتماد کیا جاتا ہے جو لوگوں کے ذہنوں میں زیادہ واضح ہو، جو الفاظ کے استعمال ہوتے ہیں، یا جن کے معانی غیر واضح ہوتے ہیں ان میں تغیرات بھی بہت جلد واقع ہوجاتے ہیں۔

۴۔ قدیم نسل سے نئی نسل کی جانب جب زبان منتقل ہوتی ہے تب بھی معنوی تغیر واقع ہوجاتا ہے، مثلاً حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کا شعر ہے:

بہالیل فی الاسلام سادو ولم یکن کاؤلہم فی الجاہلیۃ اول[1]

اس شعر میں لفظ "بہالیل" شرفاء کے معنی میں استعمال ہوا ہے، مگر موجودہ زمانے میں اب اس

---

[1] لحن العامۃ والتطور اللغوی، رمضان عبد التواب ص ۵۸؛

کے معنی فاتر العقل / مجنوں / دیوانہ کے ہو گئے ہیں۔ اسی طرح "غانیۃ" قدیم ادب میں ایسی حسین عورت کے لیے بولا جاتا ہے جو بناوٹی تزئین و آرائش سے بے نیاز ہو، جبکہ اب یہ گانے والی عورت) کیلئے مخصوص ہو گیا ہے۔ الحاجب اندلسی حکومت میں وزیر اعظم کے خصوصی محافظ کے لیے مخصوص تھا، جبکہ اب یہ ہر چوکیدار اور پہرہ دار کے لیے بولا جانے لگا ہے۔

۵۔ روزمرہ کے معمولات اور بول چال میں بھی وقت کے ساتھ الفاظ کے مفہوم میں تبدیلی واقع ہوتی رہتی ہے، بالخصوص بول و براز، جنسی عمل اور پوشیدہ اعضاء کے لیے بہت معمولی وقفہ کے بعد الفاظ کو تبدیل کرنے کی ضرورت پیش آجاتی ہے، کیونکہ جب کسی ایسے لفظ کا مفہوم زبان زد عام ہو جاتا ہے تو لطیف آدمی ان کو اپنی زبان سے ادا کرنے میں ناگواری محسوس کرتا ہے۔ نتیجہ نئی تعبیریں وجود میں آجاتی ہیں، خواہ اس کے لیے اجنبی زبان ہی سے الفاظ مستعار لینے پڑیں۔

۶۔ کبھی کبھی ایک لہجہ سے دوسرے لہجہ یا ایک زبان سے دوسری زبان کی جانب منتقلی کی وجہ سے بھی الفاظ کے معانی بدل جاتے ہیں۔ اور اس میں نفسیاتی و معاشرتی عوامل کا دخل زیادہ ہوتا ہے، بعض الفاظ بہت اوپر اٹھ جاتے ہیں یہاں تک کہ عمدہ اور چنیدہ الفاظ میں ان کا شمار ہونے لگتا ہے، اور بعض الفاظ ایسے گر جاتے ہیں کہ زبان پر انہیں لانا گوارا نہیں کیا جاتا، اور وہ گالی تصور کیے جاتے ہیں۔

۷۔ ان اوقات معانی کا انحصار الفاظ کے طبیعت، اس کے عناصر ترکیبی اور معاشرتی و سماجی حالات پر ہوتا ہے۔ ان میں جس طرح کی تبدیلیاں ہوتی ہیں، الفاظ کا مفہوم بھی اس کے ساتھ ساتھ بدلتا جاتا ہے۔ اس کی مثال "الریشہ" "القطار" اور "البرید" کے الفاظ ہیں، الریشہ اس قلم کو کہا جاتا تھا جو چڑیوں کے پروں سے بنتا تھا، اب اس کا اطلاق ایک ایسی شئی پر ہوتا ہے جو چرخ کی شکل کی ہوتی ہے، اور معدن سے نکلتی ہے، اور لکھنے ہی کے کام میں آتی ہے، القطار

ماضی میں اونٹوں کی لائن کو کہتے تھے۔ جب کارواں کی شکل میں اونٹوں سے لمبا سفر طے کیا جاتا تھا اور بالترتیب ایک اونٹ سے دوسرے کی دوڑ باندھ دی جاتی تھی، اور سب قطار میں اپنے آپ چلتے تھے، مگر اب اس کا استعمال ٹرین کیلئے معروف ہوگیا ہے۔ اسی طرح لفظ "بریدی" ماضی میں یہ لفظ ان سواریوں کے لیئے بولا جاتا تھا جن پر ڈاک جاتی تھی۔ اب باقاعدہ ڈاک کے پورے نظام کو اسی لفظ سے جانا جاتا ہے۔

لغوی تغیرات کے نتائج و مظاہر: لغوی تغیرات زیادہ انہی دو جہات میں ہوتے ہیں، اور بسا اوقات یہ فرق کرنا نہایت دشوار ہوجاتا ہے کہ یہ تغیر کس جہت سے واقع ہوا ہے، کیونکہ زبان کے بیشتر مسائل ایک دوسرے سے بالکل گتھے ہوتے ہیں، کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک لفظ کے صوتی آہنگ میں تبدیلی واقع ہوتی ہے تو یہ اختلاف معنوی تغیر پر بھی مجبور کر دیتا ہے۔ اور کبھی اس کے برعکس ہوجاتا ہے، لفظ کی معنوی تبدیلی ایسے لفظ کو اختیار کرنے پر مجبور کر دیتی ہے جو اصل میں معنی کیلئے وضع ہی نہ ہوا ہو چنانچہ لغوی اصولوں کو بروئے کار لاکر نئے الفاظ اور نئے معانی ڈھالنے پڑتے ہیں۔

اس طرح کے تغیرات سے بعض دلچسپ نتائج بھی سامنے آتے ہیں، اس موقع پر ان کا تجزیہ کرنا بھی افادیت سے خالی نہ ہوگا۔

الف: ترادف: ایک چیز کو مختلف ناموں سے ذکر کرنے کو مترادف کہا جاتا ہے۔ جیسے تلوار کے لیئے "السیف" اور "المہند" وغیرہ مختلف نام ہیں۔ قدماء کے یہاں مترادف کا یہی مفہوم بیان کیا گیا ہے[1] اور عہد جدید میں مترادف کے معنی یہ ہیں کہ "الفاظ کے معانی متحد ہوں اور ان میں کسی بھی سیاق کے اندر تبادلہ کے قابل ہوں"۔ ترادف کی تعریف میں قدیم و جدید نظریات کے اختلاف نے بہت سی رائیوں کو جنم دیا ہے، لیکن یہاں اس بحث کا موقع نہیں، سردست یہ بات موضوع سے

---

[1] احمد بن فارس، الصاحبی ص ۹۵!

متعلق ہے کہ ترادف لغوی تغیر و ارتقاء کے ایک بڑا مظہر ہے۔ اور اسی کا تجزیہ کرنا یہاں سود مند رہیگا۔

لغت میں مترادفات کے وجود میں آنے کے اسباب و عوامل بھی وہی ہیں جن کا ذکر لغوی تغیرات کے ضمن میں ہو چکا ہے۔ کسی لغت کا دیگر لغات سے تعلق مختلف سیاسی، اقتصادی، اجتماعی اور دینی حالات کی وجہ سے ہوتا ہے جس کے نتیجہ میں وہ ایک دوسرے سے متاثر ہوتی ہیں۔ اور متاثر کرتی بھی ہیں۔ شاید یہ سبب قدیم عربی ادب میں مترادفات کی کثرت بیان کرنے کیلئے کافی ہو، کیونکہ قریش کے لہجہ میں دیگر لہجات سے تعلق پیدا ہونے کے نتیجہ میں ہی بہت سے غیر قریشی الفاظ شامل گئے تھے۔ اسی طرح عربی زبان جب فارسی، رومی اور حبشی زبانوں سے باہم شیر و شکر ہوئی تو ان زبانوں کے بہت سے مفرد الفاظ اس زبان میں داخل ہو گئے، اور پھر اسی کے ہو کر رہ گئے۔ غالباً اسی وجہ سے عربی زبان میں مترادفات کی بڑی کثرت ہے،

اس میں کوئی شک نہیں کہ مترادفات لغت کے معنوی ارتقاء کا ایک مظہر ہیں، کیونکہ کسی زبان میں مترادفات کا وجود اس بات کی دلیل ہے کہ ان میں بقاء و ارتقاء کی کشمکش جاری ہے، اس کے نتیجہ میں بعض الفاظ مقبولیت کے بام عروج پر پہونچ جاتے ہیں۔ اور بعض اس طرح ترک کر دیئے جاتے ہیں کہ گردش زمانہ کے ساتھ اس کا وجود ہی باقی نہیں رہ جاتا۔ قدماء نے مترادفات کی جو مثالیں بیان کی ہیں۔ ان پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ ان کے درمیان بقاء کی واقعی کشمکش پائی جاتی ہے، مثال کے طور پر "السیف" کا لفظ ہے، اس کے درجنوں مترادفات قدماء کے یہاں پائے جاتے رہے ہیں۔ مگر اب ان میں سے بیشتر متروک ہو گئے ہیں کیونکہ ان کا عام بول چال، مقالات یا علمی نگارشات استعمال ترک کر دیا گیا ہے۔ ان کا وجود اگر کہیں تو وہ قدیم کتابوں کے صفحات میں دفن ہیں۔ یا کبھی کبھی حضرات شعراء ضرورت شعری کیلئے استعمال کر لیتے ہیں۔

ب: لفظی اشتراک: بسا اوقات کئی چیزوں کے ایک ہی نام رکھ دیئے جاتے ہیں۔ مثلاً عین الماء، عین المال، عین السحاب وغیرہ۔ قدماء نے انہیں "لفظی اشتراک" سے تعبیر کیا ہے اور مترادفات کے ہم معنی سمجھا ہے۔ بعض لوگوں نے ان میں سے ایک کو حقیقت اور دوسرے کو مجاز کے روپ میں دیکھا ہے، مگر لغویین کی بڑی تعداد نے عربی زبان میں "اشتراک لفظی" کے وجود کو تسلیم کیا ہے، اور اس کی متعدد مثالیں پیش کی ہیں۔[1]

اشتراک لفظی بھی معنوی تغیر و ارتقاء کا ایک مظہر ہے، کیونکہ بظاہر یہ بات صحیح نہیں معلوم ہوتی کہ ابتداء ہی میں بہت سی چیزوں کا ایک ہی نام رکھ دیا گیا ہو، بلکہ یہ ایک بدیہی امر ہے کہ چند مخصوص عوامل کی وجہ سے کلمات کی یہ صنف پروان چڑھی ہے۔ یہ عوامل درج ذیل ہو سکتے ہیں۔

- مختلف زبانوں اور لہجات کا ایک دوسرے سے متاثر ہونا
- کلام میں تغیر، حذف یا اضافہ کی روایت۔
- صوتی ارتقاء کا واقع ہونا
- تلفظ کی صحت کی غرض سے معنوی تبدیلی و ارتقاء وغیرہ
- اشتراک لفظی کبھی کبھی لفظ کی ظاہری ہیئت میں یک ہیئت کی وجہ سے بھی پروان چڑھتا ہے، خواہ ان دونوں الفاظ کے معانی الگ الگ ہی کیوں نہ ہو، کیونکہ عربی ادب میں ایسے بہت سے الفاظ پائے جاتے ہیں جن کی ہیئت میں مماثلت کے باوجود ان میں معنوی مطابقت نہیں پائی جاتی، جبکہ ان میں سے ہر ایک کو ایک مستقل زبان سے فروغ ملا ہے۔ اسی طرح کی مثال لفظ "برج" بمعنی قلعہ ہے، اس معنی میں یہ لفظ یونانی زبان میں برابر استعمال ہوتا رہا ہے، عربی میں یہ وہیں سے مستعار لیا گیا ہے، اگرچہ یہ مادہ عربی

---

[1] ابراہیم انیس: اللہجات العربیہ، ص ۱۹۲

میں پہلے سے موجود تھا، مگر اس کا استعمال صرف آنکھ کی روشنی اور کشش کیلئے ہوتا تھا، اس طرح وہ چیز وجود میں آئی جسے اشتراک لفظی کا نام دیا گیا۔

ج: تضاد : اس سے مراد ایسے الفاظ ہیں جو ایسے معنی پر دلالت کرتے ہیں جو بظاہر ایک دوسرے کے ضد ہوں، ماہرین لغت نے تضاد کے وجود اور عدم میں اختلاف کیا ہے، ایک گروہ جس کے سرخیل ابن درستویہ ہیں اس کے وجود کے منکر ہیں، جبکہ خلیل، سیبویہ، ابوعبیدہ، ابن فارس اور مبرد جیسے ائمہ لغت اس کی بھرپور وکالت کرتے ہیں۔[1]

صحیح بات یہ ہے کہ تضاد کے وجود سے انکار نا ممکن نہیں، قرود، مولیٰ اور منفازہ جیسے الفاظ کیلئے متضاد معانی کے حامل ہونے سے انکار نہیں کیا جا سکتا جو بلاشبہ اسی زبان کا حصہ ہیں، مگر اس کا تجزیہ بھی لغت کے ارتقاء کے تناظر میں کرنا چاہیے، کیونکہ یہ بھی اسی بحث کا ایک حصہ ہے، اور اس کے وجود میں آنے میں بھی انہی عوامل کا دخل ہے جو عام ارتقاء میں مؤثر ثابت ہوتے ہیں۔ منجملہ ان عوامل کے موقع و محل کی تبدیلی اور لہجوں کا اختلاف بھی اس کے وجود کا سبب بنتا ہے۔

د۔ اصطلاح سازی : لغوی ارتقاء کا سب سے نمایاں مظہر اصطلاحات ہیں اور یہی ہماری تحقیق کا خاص موضوع ہے، اس لئے اس پر قدرے تفصیل سے گفتگو کی جا رہی ہے،

اصطلاح کا مفہوم : "اصطلاح" کا اطلاق ایسے الفاظ پر ہوتا ہے جو اپنے لغوی معنی سے بلند ہو کر بعض دینی، سماجی، سیاسی، معاشی، اقتصادی یا اور کسی ضرورت کی وجہ سے "مخصوص معنی" میں استعمال ہونے لگتے ہیں، اور یہی معنی لوگوں کے درمیان اس مقبول و معروف ہو جاتا ہے کہ اس کا حقیقی لغوی معنی ذہنوں سے اوجھل ہونے لگتا ہے۔ تاہم ان اصطلاحی معانی میں بھی اس کے اصلی لغوی معنی کی جھلک کسی قدر ضرور موجود ہوتی

---

[1] فقہ اللغۃ، علی عبدالواحد وافی، ص ۱۸۷؛ و ابراہیم انیس، اللہجات العربیہ ص ۲۰۸؛

ہے۔ واضح رہے کہ لغوی یا اصلی معنی سے مراد وہ معنی ہے جو لفظ و مصدر کی اصل روح ہوتا ہے۔ اور جس سے تمام معانی کے چشمے نکلتے ہیں۔ مثال کے طور پر "ادب" اور "تقدس" کو لیا جا سکتا ہے۔ الفاظ کس طرح ارتقائی مراحل سے گذر کر اصطلاح کا روپ اختیار کرتے ہیں، اس سے اس بات کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

ادب کے لغوی معنی 'کھانا' کے ہیں، اس سے جو مشتقات نکلتے ہیں وہ اپنے اصلی معنی کے بالکل مطابق ہوتے ہیں۔ چنانچہ آدب کھانا پکانے والے و 'ادیب' مہمان نوازی کرنے والے اور 'مادبہ' دسترخوان کے لئے استعمال ہوتا ہے طرفہ نے اپنی قوم کی مہمانوازی پر فخر کرتے ہوئے کہا ہے:

نحن فی المشتاة ندعو الجفلی　　لا ترى الآدب فینا ینتقر [1]

قوم کا مہمان نواز بلا استثنا اپنے دسترخوان پر دعوت عام دیتا ہے اور ایسے وقت میں یہ دعوت کرتا ہے جبکہ عرب کے مخصوص موسم اور حالات کی وجہ سے بڑا سخت ہوتا ہے۔

پھر اس سے ترقی کر کے یہ لفظ "شریف آدمی" کے لئے بولا جانے لگا، کیونکہ یہ صفت بہرحال حسن اخلاق اور شرافت پر دلالت کرتی ہے۔ حدیث نبوی "ادبنی ربی فاحسن تادیبی" [2] "میرے رب نے مجھے ادب سکھایا اور خوب اچھی طرح سکھایا" یعنی میرے رب نے مجھے اعلیٰ اخلاق اور بہترین صفات سے آراستہ کیا۔ میں غالباً اسی معنی کی طرف اشارہ ہے۔

جو شخص عادتاً شریف و خوش اخلاق ہوتا ہے وہ گفتگو بھی سنجیدہ اور سلجھی ہوئی اور اچھے انداز سے کرتا ہے۔ چنانچہ شرفاء کی گفتگو کو "ادب" کہا جانے لگا۔

پھر اسی آخری معنی سے ترقی کر کے یہ لفظ باقاعدہ ایک علم اور فن کا عنوان بن گیا اور اس کا

---

[1] دیوان طرفۃ ص ۷۳؛

اس کا آخری اصطلاحی معنی یہ قرار پایا کہ "ادب ایسے خوبصورت اور مؤثر کلام کا نام ہے جو انسان کے جذبات و افکار کو جھنجھوڑ دے۔

اسی طرح "نقد" کا معاملہ ہے، نقد کے اصل لغوی معنی سکوں میں کھرے و کھوٹے کی پہچان کرنا ہیں۔ شاعر نے درج ذیل شعر میں یہی معنی مراد لیا ہے:

تنفی یداھا الحصی فی کل ھاجرۃ نفی الدراھیم تنقاد الصیارف[1]

یہ لفظ سکوں کی چھان پھٹک تک محدود نہ رہا، بلکہ اس سے ترقی کر کے یہ انسانوں کے اندر اچھی بری صفات میں تمیز کرنے کیلئے استعمال ہونے لگا۔ حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کے فرمانِ مبارک "اذا نقدت الناس نقدوک واذا ترکتھم ترکوک"[2] (جب تم لوگوں کے بارے میں کھوج کرید کرو گے تو لوگ تمہارے بارے میں بھی کھوج کرید کرنے لگیں گے، اور جب تم ان لوگوں کو اپنے حال پر چھوڑ دو گے تو وہ بھی تمہیں چھوڑ دیں گے) میں یہی معنی مراد لیا گیا ہے۔ اس کے بعد یہ لفظ ہر چیز کے درمیان تمیز کے لئے بولا جانے لگا۔ یہاں تک کہ ترقی کرتے کرتے یہ لفظ تیسری صدی ہجری میں کلام کے محاسن و عیوب کی وضاحت کے لئے مخصوص ہو گیا اور یہ لفظ اصطلاح کا درجہ پا گیا۔ اب نقد یا تنقید کا لفظ اور اس کے مشتقات جب کبھی بولے جاتے ہیں تو اس سے یہی معنی مراد ہوتا ہے اور یہ اس کا اصطلاحی معنی ہے۔

اس طرح حادث کے لحاظ سے الفاظ کے لغوی مفہوم میں برابر تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں پھر ایک مرحلہ ایسا آتا ہے کہ یہ الفاظ کسی فن کی مخصوص اصطلاح کا درجہ پا جاتے ہیں اور معنوی اعتبار سے نسبتہً زیادہ مستحکم ہو جاتے ہیں۔ زبانوں کی تاریخ میں یہ مرحلہ بار بار آتا ہے، بالخصوص نئی تہذیب، نئے علم و فن اور نئے انقلابات کے بعد نئی اصطلاحات کا وجود میں آنا ناگزیر ہو جاتا ہے۔

---

[1] احمد بدوی، أسس النقد الأدبی عند العرب ص ۱؛

[2] حوالہ مذکور ص ۲؛

قرآنی اصطلاحات : اسلام سے پہلے کا زمانہ اپنی الگ شناخت رکھتا ہے، اس کے قبائلی نظام میں تہذیبی اقدار، مذہبی امور اور معاشرتی روایات کا مخصوص مقام تھا۔ قرآن مجید کا نزول ہوا تو اس نے حالات کو یکسر بدل کر رکھ دیا۔ مذہب کا مفہوم بدلا، تہذیب کی قدریں بدلیں، رشتوں کا معیار بدلا، گویا زندگی کا پورا اسلوب بدل گیا۔ ایسے نئے حالات میں نئی اصطلاحات کا وجود میں آنا ایک فطری امر تھا۔ چنانچہ احمد بن فارس[1] اس طرح کی مثالیں پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ لفظ "حج" زمانہ جاہلیت میں قصد و ارادہ کے معنی میں مستعمل تھا، قرآن نے بھی اسے استعمال کیا، لیکن حالات کے بدل جانے کی وجہ سے اس کا مفہوم بھی کافی حد تک بدل گیا[1]، اسی طرح "زکوٰۃ" محض نمو و ارتقاء کے لئے زمانہ جاہلیت میں بولا جاتا تھا۔ قرآن نے ایک رکن اسلام کا نام قرار دے کر سابقہ مفہوم کو بالکل ہی بدل دیا۔ صلوٰۃ، صیام، جہاد، کفر اور فسق جیسے الفاظ بھی اسی قبیل سے تعلق رکھتے ہیں۔ قرآن نے ان کے بنیادی معانی کو جو زمانہ جاہلیت میں رائج تھے ایک نیا جہان عطا کر دیا۔ چنانچہ ایسے الفاظ کی تعداد کئی درجن ہوگی جن کے بنیادی مفہوم میں قرآن نے تبدیلی کی اور اصطلاح کا درجہ دیا۔

یہ اصطلاحات عربی ادب کا بہت بڑا سرمایہ ہیں اور ان کے افہام و تفہیم پر کافی توانائیاں صرف ہوئی ہیں۔ یہ سلسلہ عہد صحابہؓ سے جاری ہے۔ مگر اس زمانے میں برائے نام ہی اس کی ضرورت پیش آتی، کیونکہ یہ ان حضرات کی اپنی زبان کا معاملہ تھا، اور وہ صاحب وحیؐ کے تربیت یافتہ تھے۔ اس لئے بادنیٰ تامل پوری بات ان کے سامنے واضح ہو جاتی تھی، عہد تدوین میں جب بنیادی مصادر سے استنباط و استخراج کا مرحلہ آیا تو اخذ معانی کے لئے کچھ اصول متعین کئے گئے، اور فقہاء و مجتہدین نے انہی کی روشنی میں احکام و مسائل بیان کئے، سقوط بغداد سے خلافت کے خاتمے تک کا زمانہ عہد تقلید کہلاتا ہے، اس دور میں علمی ترقیات بہت کم ہوئیں، مولانا ابوالکلام آزادؒ

---

[1] احمد بن فارس، الصاحبی، ص ۳۴-۳۵؛

کے بقول "نقل در نقل" اس دور کا طرہ امتیاز تھا، پچھلے ادوار کی غلطیوں کو صدیوں تک دہرانے میں[1] بھی لوگوں نے تکلف نہیں کیا، اس سرد مہری سے یہ برا نتیجہ برآمد ہوا کہ بہت سی اصطلاحات کا مفہوم بالکل سکڑ کر رہ گیا، اور باطل فرقوں نے اس کی من مانی تشریح شروع کر دی تو خدائی فرمان یضل بہ کثیراً ویھدی بہ کثیراً (البقرہ ۲۶) کے متعدد مظاہر لوگوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھے، عقائد و کلام کے فلسفیانہ مباحث اسی قبیل سے تعلق رکھتے ہیں۔

ڈاکٹر احمد مصطفی الزرقاء[2] کی تحقیق کے مطابق ۱۲۸۶ھ سے ایک نئے دور کا آغاز ہوا، علمی دنیا میں تنقید و تنقیح کی روایت دوبارہ زندہ ہوئی، اس لہر کا اثر کسی حد تک موضوع زیر بحث پر بھی پڑا، فقہ اسلامی کے میدان میں اس کی ایک نظیر فی سبیل اللہ کی اصطلاح ہے، عہد نبوی و صحابہ میں اس کے مفہوم میں وسعت تھی، عہد تقلید میں اس کا مفہوم محض "قتال فی سبیل اللہ" کے لئے محدود ہو گیا، عہد نو میں عرب کے نامور علماء و محققین ڈاکٹر یوسف القرضاوی[3] اور محمود شلتوت[4] وغیرہ نے اس بحث کا از سر نو تجزیہ کیا اور اس کی وسعت بحال کی، علمی دنیا میں یہ کاوش قدر کی نگاہ سے دیکھی گئی، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ[5] نے قرآنی چار بنیادی اصطلاحوں کی کلام عرب اور نصوص شریعت کی روشنی میں تحقیق کی تو لوگوں کو "گمراہیوں" میں مبتلا پایا، استاذ الامام مولانا حمید الدین فراہیؒ نے صبر و شکر جیسی اصطلاحات کا حقیقی مفہوم دریافت کیا، 'دین' جیسی اہم

---

[1] آزاد، ترجمان القرآن ج ۱ ص

[2] الزرقاء: المدخل الفقہی العام؛

[3] یوسف القرضاوی: فقہ الزکوٰۃ ج ۲ ص ۶۳۵؛

[4] محمود شلتوت: الاسلام: عقیدۃ و شریعۃ، ص ۹۷-۹۸؛

[5] الفراہی، مفردات القرآن ص

اور بنیادی اصطلاح پر بھی غلط فہمیوں کی گرد چھا گئی تھی، مولانا صدر الدین اصلاحی[1] نے "دین کا قرآنی تصور" لکھ کر اس کے مفہوم کو نکھارا، اس طرح اصطلاحاتِ قرآن کی تشریح و توضیح کے ضمن میں کئی قابل قدر کام ہوئے، اور صحیح بات یہ ہے کہ اکابر محققین کی انہی کاوشوں سے میدانِ تحقیق کے اس نووارد کو بھی بہتر ہوگی کہ کتاب اللہ کی خدمت میں کچھ وقت صرف کرے،

[1] دین کا قرآنی تصور، مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی ۱۹۶۷ء، صفحات ۲۱۳؛

باب دوم

قرآنی اصطلاحات: تحقیق و تنقید

فصل اوّل

عقیدہ و عمل

توحید/واحد/احد

توحید: کے معنی ہیں ایک ماننا اور اس پر ایمان لانا وغیرہ۔ اسلامی عقائد میں توحید کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ بلکہ دین کا پورا نظام عقیدہ توحید پر قائم ہے، توحید کے اصطلاحی معنی ہیں "اللہ تعالیٰ کو اپنی ذات، صفات اور حقوق میں یکتا مانا جائے، اور اس کا کسی کو شریک نہ ٹھہرایا جائے، اور علامہ ابن خلدونؒ کے بقول کمال توحید یہ ہے کہ نفس میں ایسی کیفیت پیدا ہو جائے جس سے وہ بے اختیار اللہ تعالیٰ کو اپنی ذات، صفات اور افعال میں یکتا مان لے۔[1]

توحید کی دعوت قرآن کا بنیادی مقصد ہے، اس نے کائنات میں بکھری ہوئی اپنی نشانیوں سے خود اور خود انسان کے اندر طرح طرح کی نادر الخلقت چیزوں کی تخلیق سے اپنی وحدانیت پر واضح دلائل پیش کئے ہیں۔ توحید کی اس قدر اہمیت کے باوجود دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ لفظ یا اس کا کوئی مشتق قرآن مجید میں وارد نہیں ہوا ہے، بلکہ اللہ کی اس صفت کو ظاہر کرنے کے لئے قرآن مجید نے 'واحد' اور 'احد' کی دو اصطلاحیں استعمال کی ہیں جو اسی مادہ کے مصدر ثلاثی مجرد سے مشتق ہیں، ذیل میں انہی اصطلاحات کا تقابلی تجزیہ کیا جا رہا ہے۔

واحد: کے معنی ایک یا اکیلا، دو سے پہلے والا نمبر، اسی معنی میں اس کا استعمال زمانہ قدیم سے چلا آرہا ہے، اعشیٰ کا شعر ہے:

یریٰ کل ما دون الثلاثین رخصۃ ولیدما اذا کان الثمانون واحدا[2]

یہی شاعر اپنے دوسرے قصیدہ میں کہتا ہے:

فظل یجدعہا من نفس واحدہا فی أرض فیٔ بفعل مثلہ جدعا[3]

---

[1] مقدمہ ابن خلدون، ج ۱ ص ۳۶۵-۳۶۶؛

[2] دیوان اعشیٰ ص ۱۰۳؛ [3] حوالہ مذکور ص ۱۱۱

اس مضمون کے اشعار دوسرے شعراء مثلاً حاتم طائی[1]، ابو خراش[2]، الشنفرہ[3] اور عنترہ کے یہاں بھی پائے جاتے ہیں۔

قرآن مجید میں اس لفظ کا استعمال ہر جگہ اسی معنی میں ہوا ہے، مثلاً آیت قرآنی ہے:

واذ قلتم یموسی لن نصبر علی طعام واحد (بقرہ ۶۱) — اور جب تم نے کہا تھا کہ اے موسیٰ! ہم ایک ہی طرح کے کھانے پر صبر نہیں کر سکتے۔

وقال یبنی لا تدخلوا من باب واحد وادخلوا من ابواب متفرقہ (یوسف ۶۷) — پھر اس نے کہا، اے میرے بچو! ایک دروازے سے داخل نہ ہونا، بلکہ مختلف دروازوں سے جانا،

اس عمومی معنی کے علاوہ اللہ تعالیٰ کے لئے واحد کا استعمال اس پس منظر میں ہوا ہے کہ، وہ اپنی ذات، اپنے وجود، اپنی قدرت غرض ہر اعتبار سے یکتا و منفرد ہے، اللہ تعالیٰ کی صفت بننے کے بعد اس کے معنی میں خصوصیت کا مفہوم پیدا ہو جاتا ہے، جو اس کی ذات و صفات میں یکتائی و یگانگت پر دلالت کرتا ہے۔ قرآن مجید کی مندرجہ ذیل آیت میں یہ لفظ اسی معنی میں وارد ہوا ہے:

والٰھکم الٰہ واحد لا الٰہ الا ھو الرحمٰن الرحیم۔ (بقرہ ۱۶۳) — تمہارا خدا ایک ہی خدا ہے، اس رحمان و رحیم کے سوا کوئی اور خدا نہیں ہے۔

قل انما ھو الٰہ واحد وانني بریء مما تشرکون (انعام ۱۹) — کہو خدا تو وہی ایک ہے، اور میں اس مشرک سے قطعی بیزار ہوں جس میں تم مبتلا ہو۔

---

[1] دیوان الحاتم الطائی ص ۵۱،

[2] لسان العرب، بذیل مادہ احد

[3] حوالہ مذکور

احد: کے معنی ہیں پہلا عدد، ایک یا کوئی ایک، اکیلا یا پہلا، ان معنوں میں یہ لفظ قرآن مجید میں ۲۷ مرتبہ آیا ہے، جاہلی شاعری کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں بھی اس کا ہمیشہ یہی معنی مراد لیا گیا ہے۔ مثلاً نابغہ ذبیانی کے معلقہ میں ہے:

یا دار میة بالعلیاء فالسند　　اقوت وطال علیها سالف الأمد

وقفت فیها طویلاً کی أسائلها　　عیت جواباً وما بالربع من أحد[1]

اسی قصیدہ میں دوسرے مقام پر ہے:

فتلک تبلغنی النعمان إن له　　فضلاً علی الناس فی الأدنی وفی البعد

ولا أری فاعلاً فی الناس یشبهه　　وما أحاشی من الأقوام من أحد[2]

صاف ظاہر ہے کہ اس قصیدے کے مذکورہ بالا دونوں مقامات پر شاعر نے یہ لفظ 'اکیلا' یا کوئی ایک کے معنی میں استعمال کیا ہے۔

احد، دراصل اوحد ہے جو افعل کے وزن پر اسم تفضیل ہے، اسی وجہ سے اس میں اضافی طور پر السیی الفرادیت کا مفہوم پایا جاتا ہے، جو دوسرے سے بالکل ممتاز ہو، یا جس میں اولیت کا مفہوم پایا جاتا ہو، طرفہ ابن العبد نے اپنے درج ذیل شعر میں 'اوحد' اسی معنی لایا ہے

تمنی رجالٌ أن أموت وإن أمت　　فتلک سبیل لست فیها بأوحد[3]

اس معنی کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ عرب ہفتے کے پہلے دن کو 'یوم الاحد' یعنی پہلا دن کہتے ہیں جس میں اولیت واقدمیت کا پہلو نمایاں ہے۔

---

[1] دیوان النابغہ ص ۱۴

[2] حوالہ مذکور ص ۲۰

[3] دیوان طرفہ

قرآن مجید میں یہ لفظ ۲۰ مرتبہ آیا ہے، اور ہر جگہ عمومی معنی مراد لیا گیا ہے، صرف سورہ اخلاص میں دو جگہ یہ اللہ تعالیٰ کی صفت کے طور پر استعمال ہوا ہے:

قل ھو اللہ احد، اللہ الصمد، لم یلد ولم یولد ولم یکن لہ کفواً احد (اخلاص ۱-۴)

کہو، وہ اللہ ہے، یکتا، اللہ سب سے بے نیاز ہے اور سب اس کے محتاج ہیں، نہ اس کی کوئی اولاد ہے اور نہ وہ کسی کی اولاد، اور کوئی اس کا ہمسر نہیں

اس سورہ "احد" کا ترجمہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے "لیگانہ" فرمایا ہے جس میں یکتائی اور "بے ہمتائی" کے معانی پنہاں ہیں[1]، مولانا عبدالحق حقانیؒ نے اپنے اردو ترجمہ میں یہی لفظ اختیار کیا ہے، امام فراہیؒ نے "بے مثل"، اور مولانا مودودیؒ نے "یکتا" ترجمہ کیا ہے، مولانا ابوالمحمد مصلحؒ نے "واحد" اور دیگر اردو مترجمین نے "ایک" ترجمہ کیا ہے[2]، مفتی محمد شفیعؒ نے اس کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "احد اور واحد ترجمہ تو دونوں کا ایک ہی کیا جاتا ہے، مگر مفہوم کے اعتبار سے لفظ احد کے معنی میں یہ بھی شامل ہے کہ وہ ترکیب اور تجزیہ اور تعدد سے اور کسی چیز کی مشابہت اور مشاکلت سے پاک ہے"[3] اسی وجہ سے علماء نے یہ صراحت کی ہے کہ احد اللہ کی ذات کے لئے مخصوص ہے، یہ لفظ اس کے علاوہ کسی کی صفت نہیں بن سکتا۔

یہ دونوں الفاظ اپنے عمومی معنی میں جاہلی شاعری میں بھی بکثرت استعمال ہوئے ہیں، مگر اللہ تعالیٰ کی صفت کے طور پر قرآن مجید نے اسے پہلی مرتبہ استعمال کیا ہے، اور اصطلاح کا درجہ عطا کیا ہے۔

---

[1] فرہنگ آصفیہ، سید احمد دہلوی، ج ۳ ص ۲۵۴۲

[2] علامہ حمید الدین فراہی۔ حیات و افکار۔ مقالہ ڈاکٹر سید غیاث الدین ندوی ص ۳۶۲

[3] معارف القرآن ج ۱ ص

اللہ / الٰہ

اَلِہَ اِلَیہِ یَاْلَہُ کے معنی گھبرا کر کسی کی پناہ ڈھونڈھنا، نیز اَلِہَ کے معنی ہیں متحیر ہونا، اور اَلَہَ یَاْلِہُ کے معنی ہیں کسی کو پناہ دینا، امان میں لینا چنانچہ اَلِہَ بالمکان کے معنی ہیں امن و سکون کے لیے کسی مکان میں سکونت اختیار کر لینا۔ ان معانی کے اعتبار سے اِلٰہ کے معنی ہوئے ایسی ہستی جس سے خطرات میں پناہ حاصل کی جائے، جس سے مشکلات میں استمداد کی جائے اور جس کی عظمت و بلندی کے تصور سے انسان متحیر ہو جائے۔

بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ یہ لفظ لَاہَ یَلِیہُ سے مشتق ہے جس کے معنی بلند مرتبہ ہونا اور نگاہوں سے پوشیدہ ہونا ہے۔[1]

اللہ: کے سلسلے میں ایک رائے یہ ہے کہ یہ جامد لفظ ہے، کسی دوسرے لفظ سے نہیں نکلا ہے، اور دوسری رائے یہ ہے کہ اصل میں یہ لفظ ال + اِلٰہٌ = اَلْاِلٰہُ تھا کثرت استعمال سے اِلٰہٌ کا ہمزہ گر گیا اور پہلا لام دوسرے لام میں مدغم ہو گیا اس طرح یہ لفظ "اللہ" بن گیا، استاذ حسین ہمرانی نے اس لفظ کا دوسری قدیم زبانوں کے اسماء سے تقابلی مطالعہ کیا ہے، ان کی تحقیق کے مطابق عبرانی میں یہ نام لفظ "الوہ" آرامی میں "والاہ" سریانی میں "الوھا" اور جنوب عرب میں "الاہ" کی مختلف شکلوں میں مستعمل ہے۔ "اللہ" اور "اِلٰہ" دونوں لفظ مذکورہ ناموں سے کئی طرح کی مشابہت رکھتے ہیں، جن سے عربی "اللہ" کو علم ماننے والوں کے خیال کو تقویت پہونچتی ہے۔[2]

---

[1] تاج العروس، بذیل مادہ

[2] الزینۃ فی الکلمات الاسلامیۃ العربیۃ ص ۲۰

قرآن مجید "اللہ" صرف خدا کی ذات کے لیے استعمال ہوا ہے، باقی تمام اسماء اس کی صفات ہیں، جبکہ "اِلٰہ" معبود، مالک اور معبود کے معنوں میں آیا ہے، اللہ کی ذات کے لیے بطور صفت استعمال کی مثالیں:

انني انا الله لا اله الا انا فاعبدني واقم الصلوٰة لذكري (طٰہٰ ۱۴)	پس تو میری بندگی کر اور میری یاد کے لیے نماز قائم کر
الله لا اله الا هو الحيّ القيوم (البقرہ ۲۵۵)	اللہ وہ زندہ جاوید ہستی ہے جو تمام کائنات کو سنبھالے ہوئے ہے، اس کے سوا کوئی خدا نہیں
انما الله اِلٰہٌ واحد (نساء ۱۷۱)	اللہ تو بس ایک ہی خدا ہے۔
قل هو ربي لا اله الا هو عليه توكلت واليه متاب (الرعد ۳۰)	ان سے کہو کہ وہی میرا رب ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، اسی پر میں نے بھروسہ کیا اور وہی میرا ملجا و ماویٰ ہے
واِلٰهكم اِلٰہٌ واحد لا اله الا هو الرحمن الرحيم (البقرہ ۱۶۳)	تمہارا خدا ایک ہی خدا ہے اس رحمٰن و رحیم کے سوا کوئی خدا نہیں ہے۔

غیر اللہ کے لیے بھی اس کا استعمال عام ہے، قرآن مجید میں بھی اس کا استعمال پایا جاتا ہے جیسا کہ فرعون نے خود اپنے بارے میں دعویٰ کیا تھا، اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مخاطب کر کے کہا تھا:

لئن اتخذت الٰهاً غيري لاجعلنك من المسجونين (الشعراء ۲۹)	اگر تو نے میرے علاوہ کسی کو الٰہ تسلیم کیا تو تجھے قید کر دوں گا۔

بعض غیر قرآنی چیزوں پر بھی اس کا اطلاق ہوا ہے، مثلاً نفس انسانی کو الٰہ کا درجہ دے دینا

ارأيت من اتخذ الٰهه هواه	کبھی تم نے اس شخص کے حال پر غور کیا جس نے

أفأنت تكون عليه وكيلا — اپنی خواہش نفس کو اپنا خدا بنا لیا ہو کیا تم ایسے شخص
(الفرقان ۴۳) — کو راہ راست پر لانے کا ذمہ لے سکتے ہو،

ملائکہ جن اور دوسری مخلوقات کے خیالی مجسموں کو بھی "الٰہ" کہا گیا ہے:

واتخذوا من دون اللہ آلھۃ لیکونوا — ان لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر اپنے کچھ خدا بنا رکھے
لھم عزا (مریم ۸۱) — ہیں، وہ ان کے پشتیبان ہوں گے۔

کلمہ اللہ اور الٰہ دونوں کا استعمال نزول قرآن سے قبل جاہلی شاعری میں بھی بکثرت پایا جاتا تھا، یہاں بھی اس کے استعمال کی نوعیت یہی ہے کہ اللہ تو خاص اس ہستی کے لئے ہوتا ہے جو کہ تمام مخلوقات کی خالق و مالک ہے، لیکن الٰہ کا استعمال معبود حقیقی اور معبودان باطل دونوں کے لئے ہوا کرتا تھا، مثلاً امرؤالقیس کا شعر ہے:

فالیوم أسقی غیر مستحقب — إثما من اللہ ولا واغل[1]

اور عامر بن طفیل کا شعر ہے۔

صبرت عفافا لعلم اللہ أننی — أحاذر یوما مثل یوم المشقر[2]

غیر اللہ کیلئے الٰہ کا لفظ عزی شاعر کے اس مصرعے میں پایا جاتا ہے جو اس نے قبول اسلام سے قبل کہا تھا:

فقلت لنفسی حین راجعت عقلھا — أھذا إلٰہ أبکم لیس یعقل[3]

ان تصریحات سے یہ بات واضح ہوئی کہ اللہ اور الٰہ جو معروف قرآنی اصطلاح ہیں اور جن صحیح تصور کا عقائد کی درستگی میں بڑا دخل ہے، یہ اسی لفظی ساخت میں دور جاہلی میں بھی مستعمل تھے، دونوں لفظوں کے بنیادی معنی و مفہوم میں آج تک کوئی فرق واقع نہیں ہوا ہے۔

---

[1] دیوان امرئ القیس ص ۱۲۲!

[2] دیوان عامر بن طفیل ص ۶۲!

[3] کتاب الاصنام ص ۴۰!

رب

رب: اس لفظ کا مادہ ر ب ب ہے۔ جس کا ابتدائی و اساسی مفہوم پرورش کرنا ہے، پھر اسی سے تصرف، خبرگیری، اصلاحِ حال اور اتمام و تکمیل کا مفہوم پیدا ہوا، پھر اسی بنیاد پر فوقیت، سیادت مالکیت اور آقائی کے مفہومات پیدا ہو گئے لغات اور کلامِ عرب میں اس کے استعمال کی چند صورتیں یہ ہیں:

۱۔ پرورش کرنا، نشوونما دینا، بڑھانا وغیرہ۔ نابغہ ذبیانی کا شعر ہے:

ورب علیہ اللہ احسن صنعہ وکان لہ علی البریۃ ناصراً [1]

شعر میں اسی مادہ کے مصدر "ربا" و "تربیۃ" کا صیغہ ماضی پرورش و تربیت کے لئے استعمال ہوا ہے۔ مربی اسے کہتے ہیں جو تربیت کی خدمت پر مامور ہو، اور ربیب پرورده لڑکے اور ربیبہ بچے کو پالنے والی کے لئے بولا جاتا ہے۔

اسی مفہوم کی مزید وضاحت علقمہ بن عبدۃ کے اس شعر سے ہوتی ہے جو اس نے حارث بن ابی شمر الغسانی کی تعریف میں کہا ہے:

وانت امرؤ افضت الیک امانتی وقبلک ربتنی - ففضعت - ربوب [2]

۲۔ اصلاحِ حال کرنا، خبرگیری کرنا، دیکھ بھال اور کفالت کرنا وغیرہ۔ مثلاً "رب ضیعتہ" کے معنی ہوں گے فلاں شخص نے اپنی جائداد کی دیکھ بھال کی، ابوسفیان نے صفوان سے کہا تھا "لان یربنی رجل من قریش احب الی من ان یربنی رجل من ھوازن" یعنی قریش میں سے

---

[1] دیوان النابغۃ ص ۷۱

[2] المفضلیات ص ۳۹۵

کوئی شخص مجھے اپنی ربوبیت (سرپرستی) میں لے لے، یہ مجھے زیادہ پسند ہے بہ نسبت اس کے کہ ہوازن کا کوئی آدمی ایسا کرے۔ علقمہ بن عبدہ کا شعر ہے:

وأنت امرؤ أفضت إليك أمانتي وقبلك ربتني فضعت ربوب[1]

فرزدق کا کہنا ہے:

كانوا كسائلة حمقاء إذا حقنت سلاءها في أديم غير مربوب[2]

اعشیٰ کا شعر ہے:

وقد أخالس رب البيت غفلته وقد يحاذر مني ثم ما يئل[3]

حدیث نبوی میں "رب غنم یا رب ابل" کے الفاظ بھی اسی معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔

۳۔ فوقیت، بالادستی، حکم چلانا اور تصرف کرنا وغیرہ مثلاً قد رب فلان قومه یعنی فلاں شخص نے اپنی قوم کو اپنا تابع کر لیا۔ وربیت القوم کا مطلب ہے کہ میں نے قوم پر حکم چلایا اور بالادست ہو گیا۔ لبید بن ربیعہ کا شعر ہے:

وأهلكن يوماً رب كندة وابنه ورب تميم بين خبت وعرعر

وأعصفن بالروم من رأس حصنه وأنزلن بالأسباب رب المشعر[4]

۴۔ ہر چیز کا مالک ہونا۔ حدیث میں آتا ہے کہ ایک شخص نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا "رب غنم أم رب ابل" تو بکریوں کا مالک ہے یا اونٹوں کا؟ اسی معنی میں گھر کے مالک کو 'رب الدار' اونٹنی کے مالک کو 'رب الناقة' اور جائداد کے مالک کو 'رب الضيعة'

---

[1] المفضلیات، تحقیق احمد محمد شاکر ص ۳۹۵

[2]

[3] دیوان الاعشیٰ ص ۹۵ [4] دیوان لبید ص ۶۶

کہتے ہیں، نیز اعشیٰ کے مذکورہ شعر میں بھی 'رب' مالک کے معنی میں استعمال ہوا ہے

اس تجزیہ سے یہ بات معلوم ہوئی کہ کلام عرب میں 'رب' کم از کم چار معنوں میں مستعمل تھا، اور ان تمام معانی میں یہ لفظ قرآن مجید میں بھی آیا ہے۔ آیت قرآنی ہے:

قال معاذ اللہ انہ ربی احسن مثوای (یوسف ۲۳) — بخدا وہ تو میرا رب ہے جس نے مجھے اچھی طرح رکھا

اس آیت میں واضح طور پر 'رب' پروردگار کے معنی میں وارد ہوا ہے۔ ایک دوسرے مقام پر ارشاد ہوا

ھو ربکم والیہ ترجعون (ھود ۳۴) — وہ تمہارا رب ہے اور اسی کی طرف تم پلٹائے جاؤ گے

وما من دابۃ فی الارض ولا طائر یطیر بجناحیہ الا امم امثالکم ما فرطنا فی الکتاب من شیئ ثم الی ربھم یحشرون (الانعام ۳۸) — زمین میں چلنے والا کوئی جاندار اور ہوا میں اڑنے والا کوئی پرندہ ایسا نہیں ہے جو تمہاری ہی طرح ایک امت نہ ہو، اور ہم نے اپنے دفتر میں کسی کے اندراج سے کوتاہی نہیں کی ہے، پھر وہ سب اپنے رب کی طرف سمیٹے جائیں گے۔

ان آیات میں رب بمعنی حفاظت کرنے والے اور دیکھ بھال کرنے والے کے معنی میں آیا ہے،

تیسرے معنی فوقیت، بالادستی اور سرداری کی مثال درج ذیل آیات ہیں:

اتخذوا احبارھم ورھبانھم اربابا من دون اللہ (توبہ ۳۱) — انہوں نے اللہ کے بجائے اپنے علماء اور درویشوں کو اپنا رب بنا لیا

ولا یتخذ بعضنا بعضا اربابا من دون اللہ (آل عمران ۶۴) — اور ہم میں سے کوئی اللہ کے سوا کسی کو اپنا رب نہ بنائے

مذکورہ بالا دونوں آیتوں میں 'ارباب' سے مراد وہ لوگ ہیں جن کو مختلف قوموں و گروہوں نے مطلقاً

اپنا پیشوا اور رہنما مان لیا تھا، جن کے اوامر و نواہی، ضابطہ و قانون اور تحلیل و تحریم کو بلا کسی بالاتر سند کے تسلیم کیا جاتا تھا اور جنھیں بجائے خود حکم دینے اور منع کرنے کا حق دار سمجھا جاتا ہو۔

قرآن مجید میں 'رب' بمعنی 'آقا' سب سے زیادہ استعمال ہوا ہے۔ قل من رب السمٰوات ورب العرش العظیم (مومنون ۸۶) رب السمٰوات والارض وما بینھما ورب المشارق (صافات ۵) وغیرہ اس کی واضح مثالیں ہیں۔

قرآنی آیات اور کلام عرب سے یہ واضح نظائر نقل کر دینے کے بعد یہ غلط فہمی خود بخود رفع ہو جاتی ہے کہ رب کے معنی محض "پروردگار و پالنہار" کے ہیں، بلکہ یہ معنی اس کے وسیع معانی میں صرف ایک ہے۔ البتہ یہ معنی بجائے خود تمام معانی کا جامع و نچوڑ ہے۔ غالباً اسی وجہ سے اسے زیادہ مقبولیت حاصل ہو گئی۔ لغویین نے صراحت کی ہے کہ اگر مطلق 'رب' استعمال ہو تو اس سے ذات باری مراد ہوتی ہے اور ایسے مواقع پر یہ لفظ قرآنی اصطلاح کا درجہ رکھتا ہے۔

الجبّار

جبّار: سرکش، زور کرنے والا، زبردست دباؤ والا، خود مختار وغیرہ، مبالغہ کا صیغہ ہے، قرآن مجید میں یہ لفظ دس بار آیا ہے، صرف ایک مرتبہ اللہ تعالیٰ کی صفت کے طور پر اور بقیہ مقامات پر عام افراد کے لیے آیا ہے۔

لغویین نے مادہ ج ب ر مصدر "جبر" سے جبار کے معنی کی تعیین میں دو رائیں پیش کی ہیں، ابن قتیبہ کی رائے یہ ہے کہ جبار دراصل اس مقولہ سے ماخوذ ہے کہ "جبر المجبور بدہ فجبرت" یعنی جو ٹوٹے والے نے اس کا ہاتھ جوڑ دیا اور وہ ٹھیک ہو گیا، اسی سے ٹوٹے ہوئے کو جوڑنا، نقصان کی تلافی کرنا وغیرہ کے معنی پیدا ہوئے، اللہ تعالیٰ چونکہ اپنے فیضان رحمت سے لوگوں کے نقصانات کی تلافی کرتا ہے، ان کے احوال میں بہتری لاتا ہے، اس لیے اس صفت کے اظہار کے لیے مجازاً جبار کا لفظ بول دیا گیا ہے[1]۔ جبکہ دوسری رائے یہ ہے کہ جبار دراصل صفت جبر بمعنی زبردستی و قہر سے ماخوذ ہے۔ اس پر ابو حاتم الرازی نے یہ اعتراض کیا ہے کہ زور زبردستی اللہ تعالیٰ کی شان عالی کے منافی ہے، یہ ایسے مطلق العنان حکمرانوں کی صفت ہے جو حق و انصاف کو بالائے طاق رکھ کر اپنی مرضی کا نفاذ طاقت کے بل پر کرتے ہیں[2]۔ ایک اور رائے یہ ہے کہ 'جبر' کے معنی میں ایک طرح کی زبردستی کے ساتھ کسی شئی کی اصلاح کرنے کا بھی مفہوم ہے، مثلاً کہا جاتا ہے کہ "جبرت الفقیر" میں نے فقیر کی حالت درست کر دی، اسے تونگر بنا دیا، اس کا استعمال کبھی صرف زبردستی یا صرف اصلاح کے لیے بھی ہوتا ہے اور کبھی جبار اس کو بھی کہہ دیتے ہیں جس کا دوسرے پر دباؤ اور زور ہو۔

[1] اساس البلاغۃ مادہ جبر؛

[2] الزینہ ج ۲ ص ۸۳

قرآن مجید میں یہ لفظ تینوں معانی میں وارد ہوا ہے۔ زبردستی بغرض اصلاح کی مثال آیت:

هو الله الذی لا اله الا هو الملک القدوس	وہ اللہ ہی ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں،
السلام المؤمن المهیمن الجبار المتکبر	وہ بادشاہ ہے، نہایت مقدس سراسر سلامتی
(الحشر ۲۳)	امن دینے والا، نگہبان، سب پر غالب اور
	اپنا حکم بزور نافذ کرنے والا۔

ہے اور محض زبردستی کی مثال درج ذیل آیت ہے

وعصوا رسله واتبعوا امر کل جبار عنید	اس کے رسولوں کی نافرمانی کی اور ظالم دشمن حق
(ہود ۵۹)	کی پیروی کرتے رہے۔

اور صرف دباؤ و برتری کے لیے یہ آیت پیش کی جا سکتی ہے

وما انت علیهم بجبار

ان سب کے علاوہ جبار میں عظمت کا بھی مفہوم شامل ہے، عربی میں کھجور کے درخت کو جبار کہتے ہیں جو اتنا بلند و بالا ہو کہ اس کا توڑنا کسی کے لیے آسان نہ ہو، امرؤ القیس کا شعر ہے:

سوامق جبار اُنبت فروعه	وعالین قنوانا من البسر احمرا[1]

اور الجعدی کا شعر ہے:

بتثلیث او نخل منفوخة	مواقیر جبارة المرطب[2]

اللہ تعالیٰ کے اسم گرامی "الجبار" میں عظمت و کبریائی کا مفہوم بھی ہے اور بجبر اصلاح کا!

---

[1] دیوان امرؤ القیس ص ۵۷!

[2] الزینہ ج ۲ ص ۸۱!

بھی، بلاشبہ ذاتِ باری میں عظمت و کبریائی کے گوناگوں پہلو بھی ہیں اور وہ اپنے ارادوں و احکام کو جبراً نافذ کرنے کی بھی صلاحیت رکھتا ہے، چونکہ وہ جبار و قہار ہونے کے ساتھ ساتھ عادل و حکیم بھی ہے، اس لیے اس کے احکام اور فیصلوں میں عدل و حکمت اور جبر و قہر کا امتزاج ہوتا ہے، اس لیے اس کی صفت جبر میں بھی مدح کا پہلو ہے۔

عربی ادب میں اس کا استعمال زیادہ تر مذمت کے مفہوم میں ہوا ہے، یہ قرآن مجید کی ایک نئی اصطلاح ہے، قرآن نے مروجہ معنی میں ترقی کرکے اس میں مدح کا مفہوم پیدا کیا ہے، اور ذاتِ باری سے انتساب کی وجہ سے اس میں اختصاص کا مفہوم بھی پیدا ہوگیا ہے۔

الصمد

الصمد : مادہ ص م د ، باب نصر وضرب ، مصدر صَمْدٌ کے معنی ہیں : قصد کرنا ، ارادہ کرنا۔ صَمَدٌ اسی سے فَعَلٌ کے وزن پر صیغۂ صفت بمعنی مفعول ہے ، یعنی جس سے رجوع کیا جائے ، چونکہ قوم کا سردار اپنی رعایا کا ملجا و ماوی ہوتا ہے ، اسی لئے سربراہ قوم کے لئے بھی یہ بولا جاتا ہے ، بلند مقامات یا چٹانوں سے ہوا ٹکراتی رہتی ہے اس لئے مجازاً بلندی اور چٹانوں کے لئے بھی صمد کا استعمال لغویین نے کیا ہے۔

یہ صفت کا صیغہ ہے ، اور قرآن مجید میں صفت کے طور پر وارد ہوا ہے ، اسی بنیادی معنی کی مناسبت سے حضرات مفسرین نے اس کا ترجمہ بے نیاز[1] ، سب سے بے نیاز[2] ، حاجت روا[3] بے احتیاج[4] ، نرادھار[5] اور باہمہ[6] کیا ہے ، یہ لفظ اب قرآنی اصطلاح کا درجہ رکھتا ہے۔

جاہلی شاعری میں بھی اس کا استعمال اپنی معانی کے لئے ہوا ہے ، کسی جاہلی شاعر کا مصرع ہے

یزعمون الجهل فی مجلسهم وهم الضارون الحلم الصمد[7]

اسی معنی میں عبید بن الابرص کا بھی ایک شعر ہے :

لقد بکر الناعی بخیری بنی أسد بعمرو بن مسعود وبالسید الصمد[8]

---

۱ شاہ ولی اللہ دہلوی ، فارسی ترجمۂ قرآن

۲ تفہیم القرآن ج ۶ ص ۵۳۵

۳ اشرف علی تھانوی ، بیان القرآن

۴ شاہ رفیع الدین ، ترجمۂ قرآن

۵ شاہ عبدالقادر ، ترجمۂ قرآن

۶ حمید الدین فراہی ، تفسیر نظام القرآن ص ۵۲۳

۷ کتاب الزینہ ج ۲ ص ۴۳

۸ حوالہ مذکور

طرفہ بن العبد نے اپنے اوپر فخر کرتے ہوئے کہا:

وان یلتقی الحی الجمیع تلاقنی　　إلی ذروۃ البیت الرفیع المصمد[1]

ان اشعار کے مطالعہ سے صاف ظاہر ہے کہ کلام عرب اور لغت قرآن میں کوئی خاص فرق نہیں ہے، البتہ اللہ تعالیٰ کی صفت ہونے کی وجہ سے اس کے معانی میں اختصاص پیدا ہوگیا ہے، اور قرآن مجید نے جس خاص سیاق میں اسے استعمال کیا ہے، اس نے اس کے معانی میں بڑی جامعیت پیدا کردی ہے۔

السبحان والتسبیح

السبحان والتسبیح: اس کا مادہ س ب ح اور مصدر ثلاثی سَبْحٌ ہے۔ اس کے بنیادی معنی تیرنے کے ہیں، جیسا کہ کسی شاعر نے کہا ہے:

وماء یغرق السبحار فیہ　　سفینتہ المواشکۃ الجنوب[1]

اسی بنیادی معنی سے ترقی کر کے یہ مصدر دور نکل جانے کے لئے بولا جانے لگا، چنانچہ تیز رفتار گھوڑوں کے لئے "السابح" یا "السابحات" کا لفظ عام ہے، جیسا کہ امرؤالقیس نے اپنے معلقہ میں کہا ہے:

ویشبح اذا ما السابحات علی الونی　　اثرن الغبار بالکدید المرکّل

یزل الغلام الخف عن صهواته　　ویلوی بأثواب العنیف المثقل[2]

بعینہا دوری و تیز رفتاری کے اس مفہوم نے اتنی وسعت اختیار کرلی کہ یہ نظروں سے اوجھل ہوجانے والے کے لئے بھی بولا جانے لگا، چونکہ اللہ کی ذات انسان کی نظروں سے اوجھل ہے، اس لئے ذات باری پر بھی اس کا اطلاق ہوا ہے۔ اعشیٰ نے اسی مفہوم میں یہ لفظ استعمال کیا ہے

وسبّح علی حین العشیات والضحیٰ　　ولا تعبد الشیطان واللہ فاعبدا[3]

چونکہ اللہ تعالیٰ کی ذات قوت ادراک سے بہت دور ہے، اور ان باتوں سے بھی دور ہے جو اس کے لئے سزاوار نہیں ہیں اس لئے اس کی صفت کے اظہار کے لئے بھی مجازاً سبحان اور تسبیح کے مشتقات استعمال ہونے لگے جیسا کہ امیہ بن ابی الصلت نے کہا ہے:

سبحانہ ثم سبحاناً یعود لہ　　وقبلنا سبح الجودی والجمد[4]

---

[1] لسان العرب بذیل مادہ

[2] شرح المعلقات السبع ص ۳۲، و دیوان امرئ القیس ص ۲۰

[3] دیوان الاعشیٰ الکبیر ص ۱۳۲　[4] دیوان امیہ بن ابی الصلت ص ۳۰

اس آخری معنی سے ایک اور معنی "تعجب" کا بھی نکلا ہے، مثلاً جب کوئی شخص ایسی کوئی بات بیان کرتا ہے جس میں مکر و فریب اور تلبیس کا پہلو غالب ہوتا ہے تو سننے والا فوراً پکار اٹھتا ہے "سبحان اللہ"، اسی مفہوم میں اعشیٰ کا شعر ہے:

أقول لما جاءنی فخره — سبحان من علقمة الفاخر[1]

ان تصریحات سے یہ بات واضح ہوئی کہ سبحان اور تسبیح کے بنیادی معنی سے کم از کم تین مزید معانی پیدا ہوتے ہیں، ۱۔ ذکر اللہ ۲۔ تنزیہ اللہ ۳۔ تعجب، قرآن نے بھی ان الفاظ کو بنیادی معنی کے علاوہ مذکورہ تینوں معانی میں استعمال کیا ہے: بنیادی معنی کی مثال:

وھو الذی خلق اللیل والنھار والشمس والقمر کل فی فلک یسبحون (انبیاء ۳۳)	اور وہ اللہ ہی ہے جس نے رات اور دن بنائے، سورج اور چاند کو پیدا کیا، سب ایک ایک فلک میں تیر رہے ہیں۔
لا الشمس ینبغی لھا ان تدرک القمر ولا اللیل سابق النھار وکل فی فلک یسبحون (یٰس ۴۰)	نہ سورج کے بس میں یہ ہے کہ وہ چاند کو جا پکڑے، اور نہ رات دن پر سبقت لے جا سکتی ہے، سب ایک ایک فلک میں تیر رہے ہیں۔

ان آیات میں فضا کو بحر کے مشابہ سمجھا گیا ہے اور شمس و قمر کی گردش کو اسی اعتبار سے "سبح" یعنی تیرنے سے تعبیر کیا ہے۔

ذکر الٰہی کے معنی میں درجنوں مقامات پر یہ لفظ وارد ہوا ہے:

واذکر ربک کثیراً وسبح بالعشی والابکار (آل عمران الٰہی)	اس دوران اپنے رب کو بہت یاد کرنا اور صبح و شام اس کا ذکر کرتے رہنا۔

---

[1] دیوان الاعشیٰ الکبیر ص ۱۴۳

سبح للہ ما فی السموات والارض وھو العزیز الحکیم (الحشر ۱)

اللہ ہی کی تسبیح کی ہے ہر اس چیز نے جو آسمانوں اور زمین میں ہے، اور وہی غالب اور حکیم ہے۔

تنزیہ یعنی اللہ تعالیٰ کو تمام عیوب و نقائص سے پاک قرار دینے کے سلسلے میں بھی بکثرت آیا ہے!

أم لہم إلٰہ غیر اللہ سبحٰن اللہ عما یشرکون (طور ۴۳)

کیا اس کے سوا یہ کوئی اور معبود رکھتے ہیں، اللہ پاک ہے اس شرک سے جو یہ لوگ کر رہے ہیں۔

وجعلوا بینہ وبین الجنۃ نسبا ولقد علمت الجنۃ انہم لمحضرون سبحٰن اللہ عما یصفون (صافات ۱۵۸-۱۵۹)

انہوں نے اللہ اور ملائکہ کے درمیان نسب کا رشتہ بنا رکھا ہے، حالانکہ ملائکہ خوب جانتے ہیں کہ یہ لوگ مجرم کی حیثیت سے پیش ہونے والے ہیں، (اور وہ کہتے ہیں کہ) اللہ ان صفات سے پاک ہے۔

ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی صحابیؓ نے "سبحان اللہ" کا معنی پوچھا، تو آپؐ نے فرمایا "ھو تنزیہ اللہ عن کل سوء" اللہ تعالیٰ کو تمام برائیوں سے پاک قرار دینا ہے۔

سبحان بمعنی تعجب کی مثال درج ذیل آیت ہے:

أو یکون لک بیت من زخرف أو ترقی فی السماء ولن نؤمن لرقیک حتی تنزل علینا کتابا نقرؤہ، قل سبحان ربی ھل کنت الا بشرا رسولا (الاسراء ۹۳)

یا تیرے لئے سونے کا ایک گھر بن جائے یا تو آسمان پر چڑھ جائے، اور تیرے چڑھنے کا بھی ہم یقین نہ کریں گے، جب تک تو ہمارے پاس ایک ایسی تحریر نہ اتار لائے، جسے ہم پڑھیں، اے نبی ان سے کہو، پاک ہے میرا پروردگار! کیا میں ایک پیغام لانے والے انسان کے سوا اور بھی کچھ ہوں۔

سبحان و تسبیح کے استعمالات سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ جاہلی ادب اور لغت قرآن دونوں کے معنی و مفہوم میں کوئی خاص فرق نہیں ہے، البتہ قرآنی استعمالات میں یہ فرق ملحوظ رکھا گیا ہے کہ قرآن نے صرف "سبح" کو لغوی معنی میں استعمال کیا ہے اور تسبیح صرف ذکر و تنزیہہ کے معنی میں جبکہ "سبحان" مذکورہ تینوں معانی پر محیط ہے۔

الرحمٰن والرحیم

رحمان و رحیم: یہ دونوں لفظ اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنیٰ میں سے ہیں، قرآن مجید میں یہ اسماء بکثرت وارد ہوئے ہیں، یہ مادہ رحم مصدر رَحْمٌ و رحمۃٌ سے مشتق ہے، رَحْمٌ کے معنی "جائے حمل" یا ولادت کے بعد عورت کے درد محسوس کرنے کے ہیں، رحمۃ کا مشہور معنی رقت، نرمی، تعطف، شفقت اور مغفرت وغیرہ اسی سے ماخوذ ہیں، لغویین نے موقع اور طریقہ استعمال کی مناسبت سے بھی اس کے معانی میں فرق بیان کیا ہے، ابن منظور نے لکھا ہے کہ رحمۃ کی نسبت جب اللہ تعالیٰ کی طرف ہوتی ہے تو اس سے مراد بندوں پر احسان و انفضال اور انعام و اکرام ہوا کرتا ہے، اور اگر مخلوق کی جانب ہو تو اس سے مقصود رقتِ قلب ہوتی ہے۔[1]

رحمٰن کی اصلیت کے سلسلے میں بھی لغویین کے درمیان اختلاف ہوا ہے، کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ رحمٰن مبالغہ اور رحیم صفت کا صیغہ ہے، ایک کا وزن فَعْلَانُ اور دوسرے کا فَعِیْلُ ہے، ایک کا خاصہ شدت اور ہیجان ہے اور دوسرے کا پائیداری و استواری، دونوں صفات کا ذات باری کے لئے بیک وقت استعمال ایک خاص معنی پیدا کر دیتا ہے، ایک خدا کے جوش و رحمت کو ظاہر کرتی ہے تو دوسری اس کے دوام و تسلسل کو۔[2] بعض لوگوں کی رائے ہے کہ یہ ایک مستقل لفظ ہے، رحمۃ سے مشتق نہیں۔[3] بعض حضرات اس کے عربی الاصل ہونے ہی کے منکر ہیں، وہ اسے عبرانی خیال کرتے ہیں، کیونکہ عربوں کے ہاں اس کا استعمال پایا ہی نہیں جاتا۔[4]

---

[1] لسان العرب، بذیل مادہ!

[2] امین احسن اصلاحی، تدبر قرآن ۱/۲۸! یہی رائے جمہور مفسرین کرام کی ہے۔

[3] بیہقی، کتاب الاسماء والصفات

[4] سیوطی، الاتقان فی علوم القرآن ج ۱ ص ۲۳۲!

ان اقوال میں جمہور نے اول الذکر قول کو ترجیح دی ہے۔ انہوں نے اس بات کی تردید کی ہے کہ اہل عرب کے لئے یہ نامانوس لفظ تھا۔ ان کا خیال ہے کہ علماء یہود کے یہاں تو یہ لفظ بکثرت پایا جاتا ہے، اس کی تائید ماقبل اسلام کے ان آثار سے ہوتی ہے جو زمانہ مابعد میں پائے گئے، جہاں تک عربوں کا تعلق ہے تو کلام عرب میں بھی بعض ایسی نظیریں پائی جاتی ہیں جن میں یہ لفظ مستعمل ہے، اور ٹھیک انہی معنوں میں استعمال ہوا ہے جن کا رواج آج ہے، مثلاً سلامہ بن جندل کا شعر ہے:

عجلتم علینا عجلتین علیکم ومن یشاء الرحمٰن یعقد ویطلق[1]

کلام عرب اور قرآن کے استعمالات میں فرق صرف اتنا ہے کہ جاہلی ادب میں یہ لفظ بہت کم آیا ہے، جبکہ قرآن مجید میں بہت کثرت کے ساتھ وارد ہوا ہے۔ اور ہر جگہ اللہ تعالیٰ کے لئے ہی آیا ہے ایک جگہ تو قرآن نے بہت واضح الفاظ میں یہ کہا ہے کہ اللہ اور رحمٰن میں کوئی فرق نہیں ہے، ایک ہی ذات کے یہ سب نام ہیں!

قل ادعوا اللہ او ادعوا الرحمٰن، ← اے نبی! ان سے کہو اللہ کہہ کر پکارو یا رحمٰن کہہ کر جس نام سے بھی پکارو اس کے لئے

ایاما تدعوا فلہ الاسماء الحسنیٰ سب اچھے ہی نام ہیں۔

(اسراء ۱۱۰)

حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے رحمٰن و رحیم کے درمیان یہ لطیف فرق بیان کیا ہے کہ "رحمٰن دنیا کے لئے اور رحیم آخرت کے لئے، کیونکہ دنیا میں اس کی رحمت مومن و کافر سب کے لئے عام ہے، اور آخرت میں مومن کے ساتھ مخصوص ہے۔ یا مغایرت کسی اور جہت سے ہے کہ رحمٰن تو اس حیثیت سے زیادہ بلیغ ہے کہ وہ بڑی بڑی نعمتوں اور ان کے اصولوں پر مشتمل ہے، جیسے کوئی غصہ

---

[1] الاصمعیات، تحقیق احمد محمد شاکر و عبد السلام ص ۱۳۶؛

سے بھرا ہو تو اسے غضبان کہتے ہیں، اور رحیم کو اس کے بعد ہی اس لیے لایا گیا ہے کہ تتمہ کے طور پر چھوٹی نعمتوں کو شامل ہو جائے۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے قدرے مختلف لیکن دل لگتی توجیہ کی ہے کہ "اگرچہ یہ دونوں اسم رحمت کے دو مختلف پہلوؤں کو نمایاں کرتے ہیں۔ عربی میں فعلان کا وزن بالعموم عارضی صفات کے لیے ہوتا ہے، فعلی ظہور ان کے لیے ضروری نہیں ہوتا۔ جیسے پیاسے کے لیے عطشان، غضبناک کے لیے غضبان، سراسیمہ کے لیے حیران، مست کے لیے سکران، لیکن فعیل کے وزن میں صفات قائمہ وفاعلہ کا خاصہ ہے، یعنی ایسی صفات کے لیے بولا جاتا ہے جو جذبات وعوارض ہونے کی جگہ صفات قائم ہوتی ہیں، اور اپنا فعلی ظہور بھی رکھتی ہیں۔ مثلاً کریم کرم کرنے والا، عظیم بڑائی رکھنے والا، حکیم حکمت رکھنے والا، پس الرحمٰن کے معنی یہ ہوئے کہ وہ ذات جس میں رحمت ہے اور الرحیم کے معنی یہ ہوئے کہ وہ ذات جس میں نہ صرف رحمت ہے بلکہ جس کی رحمت اپنا فعلی ظہور بھی رکھتی ہے اور تمام کائنات اس سے فیضیاب ہو رہی ہے۔"[1]

[1] ترجمان القرآن ج ۱ ص ۳۹؛

قضا و قدر

قضا و قدر: عربی زبان کے دو متداول الفاظ ہیں، زمانہ جاہلی اور زمانہ اسلام دونوں میں اس کا استعمال یکساں ہوا ہے۔ قرآن مجید نے اسے لغوی معانی سے بلند کر کے اصطلاح کا درجہ دیا ہے، تاہم آج بھی یہ الفاظ لغت و اصطلاح ہر دو معنی میں مستعمل ہیں، موقع و محل کے لحاظ سے مفہوم کی تعیین کی جاتی ہے

قضاء: کتب لغت میں قضاء کے متعدد معانی بیان ہوتے ہیں، مثلاً فیصلہ کرنا، اندازہ کرنا، کسی امر کو یقینی بنانا اور آخری انجام وغیرہ۔ فیصلہ کرنے کے معنی میں حارث بن حلزہ الیشکری نے اپنے معلقہ میں استعمال کیا ہے:

ایها الناطق المبلغ عنا　　عند عمرو و هل لذاک انتهاء
من له عندنا من الخرج ما ت　　ئلک فی کل عام القضاء[1]

کسی کام کو پایۂ تکمیل تک پہونچ جانے یا انجام پا جانے کے معنی پر اوس بن حجر کا یہ شعر دلالت کرتا ہے:

ام هل کبیر بکی لم یقض عبرته　　اثر الاحبة یوم البین معذور[2]

موت یعنی آخری انجام کے لئے اس لفظ کو زہیر نے بھی اختیار کیا ہے:

فقضوا منایا بینهم ثم اصدروا　　الی کلأ مستوبل متوخم[3]

اور اللہ تعالیٰ کی مرضی اور فیصلوں کے بارے میں شموئل بن عادیہ نے بہت مناسب موقع پر استعمال کیا ہے

---

[1] شرح المعلقات السبع ص ۱۷۷؛

[2] دیوان اوس بن حجر ص ۳۹؛

[3] شرح المعلقات السبع ص ۹۰؛

بل لکل من رزقه ما قضی اللہ وان حلت الفہ المستمیت[1]

قرآن مجید میں بھی یہ لفظ کئی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

(۱) ضرورت پوری کرنا، یا جنسی تسکین حاصل کرنا۔ حضرت زینبؓ کا نکاح پہلے حضرت زیدؓ سے ہوا تھا، جو رسول اللہ کے منہ بولے بیٹے تھے، لیکن جب انہوں نے انہیں طلاق دے دی تو ان کا نکاح آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہوا، اسی سلسلے میں یہ آیت نازل ہوئی،

فلما قضی زید منہا وطرا زوجنا کہا	جب زید اس سے اپنی حاجت پوری کر چکا تو
لکی لا یکون علی المؤمنین حرج فی	ہم نے اس کا تم سے نکاح کر دیا، تاکہ مومنوں پر
ازواج ادعیائہم اذا قضوا منہن	اپنے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں کے معاملہ میں
وطرا	کوئی تنگی نہ رہے، جب کہ وہ ان سے اپنی
(احزاب ۳۷)	حاجت پوری کر چکے ہوں۔

(۲) موت آجانا یا جان سے مار ڈالنا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے قبطی کو جو گھونسے کی چوٹ ماری تھی اس کے بارہ میں آیا ہے:

فوکزہ موسیٰ فقضیٰ علیہ (قصص ۱۵) موسیٰ نے اس کو ایک گھونسا مارا اور اس کا کام تمام کر دیا۔

(۳) کسی کام کو پایۂ تکمیل تک پہونچانا، سورہ احزاب میں مومنین مہاجرین کے بارے میں ارشاد ہوا ہے کہ:

من المؤمنین رجال صدقوا ما عاہدوا	ایمان لانے والوں میں ایسے لوگ موجود ہیں، جنہوں نے
اللہ علیہ فمنہم من قضی نحبہ ومنہم	اللہ سے کئے ہوئے عہد کو سچا کر دکھایا، ان میں سے کوئی
من ینتظر (احزاب ۲۳)	اپنی نذر پوری کر چکا، اور کوئی وقت آنے کا منتظر ہے۔

---

[1] الاصمعیات ص ۸۶

(۴) فیصلہ کرنا اور انصاف کرنا وغیرہ، خالص قانونی وعدالتی زبان میں بھی اس کا استعمال ہوا ہے،

ولکل امۃ رسول فاذا جاء رسولھم قضی بینھم بالقسط وھم لا یظلمون۔ (یونس ۴۷)

اور ہر امت کے لئے ایک رسول ہے، سو جب ان کا رسول ان کے پاس آجاتا ہے اور احکام پہونچا دیتا ہے تو ان کا فیصلہ انصاف کے ساتھ کیا جاتا ہے، اور ان پر ظلم نہیں کیا جاتا۔

(۵) فطری قانون اور اللہ کا فیصلہ: یہی معنی سب سے زیادہ مشہور ہیں، اور اسی کو اصطلاح کا درجہ حاصل ہوا ہے۔

اذا قضی امراً فانما یقول لہ کن فیکون (البقرہ ۱۷)

اللہ تعالیٰ جب کسی کام کو کرنے کا فیصلہ کرتا ہے تو اسے کہتا ہے ہوجا اور وہ ہوجاتا ہے،

"قدر و تقدیر" اور اس کے مشتقات کلام عرب اور قرآن مجید دونوں میں بکثرت استعمال ہوئے ہیں، یہ لفظ اپنے لغوی معنی میں بڑی وسعت رکھتا ہے، اور موقع و محل کی مناسبت سے دس سے زیادہ معانی میں استعمال ہوا ہے، اگر ان کے دائرہ کو بہت سمیٹا جائے تو بھی انہیں کم از کم تین خانوں میں تقسیم کرنا ہوگا:

(الف) حکم و ارادہ، (ب) استطاعت و امکان (ج) تدبیر و توقیت۔

حکم و ارادہ کے معنی میں عمرو بن کلثوم کا یہ شعر پیش کیا جاسکتا ہے:

وانا سوف تدرکنا المنایا مقدرۃ لنا و مقدرینا[1]

اور توقیت و تحدید کے معنی میں لبید کا یہ شعر ہے:

---

[1] شرح معلقات السبع ص ۱۲۷؛

فقدرت للورد المغلس عدوه فوردت قبل تبين الألوان[1]

قرآن مجید میں ایسی بے شمار آیات ہیں جو ان الفاظ و معانی کے ساتھ وارد ہوئی ہیں،

حکم و فیصلہ کے معنی میں:

الا امرأته قدرنا انها لمن الغابرين سوائے اس کی بیوی کے جس کے لئے ہم نے مقدر
(الحجر ۶۰) کر دیا ہے کہ وہ پیچھے رہ جانے والوں میں شامل رہے گی۔

استطاعت و امکان کے معنی میں:

ضرب الله مثلا عبدا مملوكا لا يقدر على اللہ ایک مثال دیتا ہے ایک تو ہے غلام جو دوسرے
شيء (نحل ۷۵) کا مملوک اور خود کوئی اختیار نہیں رکھتا۔

توقیت و تحدید کے معنی میں:

والقمر قدرناه منازل حتى عاد كالعرجون اور چاند اس کے لئے ہم نے منزلیں مقرر کر دی ہیں
القديم (یٰس ۳۹) یہاں تک کہ ان سے گزرتا ہوا وہ کھجور کی سوکھی شاخ کے
مانند رہ جاتا ہے۔

قضا و قدر لغوی طور پر وسیع تر ہونے کے باوجود اپنا ایک مخصوص اصطلاحی معنی بھی رکھتا ہے، اور اسے یہ رتبہ قرآن مجید نے عطا کیا ہے۔ کلام عرب میں اصطلاحی معنوں میں اس کا کہیں استعمال نہیں پایا جاتا۔

قرآن مجید کے نزدیک قضاء الٰہی سے مراد وہ احکام و فیصلے ہیں جو اس نے اپنے بندوں اور کائنات کے تعلق سے کر رکھے ہیں اور قدر سے مراد روزمرہ کے معاملات میں ان کی تنفیذ ہے۔

قضا و قدر اسلامی عقائد میں ایک اہم رکن ہے۔ قضا و قدر پر ایمان لائے بغیر ایمان مکمل نہیں ہوتا۔

---

[1] دیوان لبید ص ۲۰۷؛

الرسالة والنبوة

الرسول: مادہ ر س ل مصدر رَسَلاً و رِسَالۃً کے معنی ہیں بالوں کا سیاہ لٹکا ہوا ہونا، یا اونٹ کا نرم چال والا ہونا یا پیغام، اسی مادہ سے باب افعال ارسال کے معنی ہیں بلا قید بھیجنا اور ارسل بہ و الیہ کے معنی ہیں پیغام کے ساتھ بھیجنا، رسول کے معنی پیغامبری پر مامور قاصد کے ہیں۔

کلام عرب میں رسالۃ، رسول اور اس سے متعلق الفاظ بعض مذکورہ لغوی مفہوم میں ہی استعمال ہوئے ہیں، دواوین عرب میں اس کی متعدد مثالیں موجود ہیں طرفہ کا شعر ہے:

ألا أبلغا عبد الضلال رسالۃ وقد یبلغ الانباء عنک رسول[1]

اور اعشیٰ نے کہا ہے:

فأبلغ بنی عجل رسولا وانتم ذوو نسب وان وجد مؤمل[2]

اس کے علاوہ اور بھی متعدد اشعار پائے جاتے[3]

النبی: لفظ نبی کا مادہ ن ب ء یا ن ب و ہے، اور مصدر نبأً و نبوۃً ہے نبی صفت مشبہ کا صیغہ ہے، جس کے معنی خبر پہونچانے والا، قاصد یا پیغام بر کے ہیں، جاہلی ادب میں اس لفظ کا بھی استعمال پایا جاتا ہے، مگر اس وقت یہ صرف اپنے بنیادی لغوی مفہوم — بلند ہونا، اوپر اٹھنا، خبر دینا وغیرہ — ہی میں مستعمل تھا، مثلاً اوس بن حجر نے فضالہ بن کلدہ الاسدی کے مرثیہ میں کہا ہے:

---

[1] دیوان طرفہ ۱۱۸

[2] دیوان اعشیٰ ص ۳۵۳ [3] دیکھئے دیوان نابغہ ۶۷ و دیوان اعشیٰ ص ۵۳

على الأروع السقب لوانه لقوم على ذروة الصاقب
الاصبح رتما وفاق الحصى مكان النبي من الكاثب[1]

پیغام پہونچانے کے معنی میں ابوذؤیب نے کہا ہے کہ :

كما تغبط الدلف المتبل بالبر تبنوه مسترحيا[2]

ان دونوں الفاظ کو قرآن مجید نے مخصوص اصطلاحی معنی میں استعمال کیا ہے، اگرچہ اس مادے کے دوسرے مشتقات لغوی مفہوم میں بھی وارد ہوتے ہیں۔ قرآنی اصطلاح میں رسول و نبی کا مطلب اللہ کا پیغام بندوں تک پہونچانے والا ہے۔ یہ مفہوم ایسا عام ہوا کہ اس کا لغوی معنی تقریباً متروک ہوگیا ہے۔

اسلامی عقائد میں 'رسالۃ' کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ مسلمان ہونے کے لئے تصور رسالت کو تسلیم کرنا، سلسلہ انبیاء کو حقیقی ماننا ضروری ہے۔ تقریباً ۲۵ انبیاء کرام کے اسماء گرامی اور ان کی دعوتوں و قربانیوں کا تذکرہ قرآن مجید میں تفصیل سے آیا ہے، ان سب پر تفصیل ایمان لانا اور جن انبیاء کا ذکر قرآن مجید میں نہیں آیا ہے مگر قرائن ان کے فرستادہ ہونے پر دلالت کرتے ہوں ان پر مجموعی طور سے ایمان لانا ضروری ہے۔

عقیدہ رسالت اسلامی عقائد میں ایک اہم بنیادی عقیدہ ہے، اس عقیدہ کی رو سے اللہ تعالیٰ کے حقیقی پیغام اور اس کی تعلیمات کو صحیح طور سے حاصل کرنے کے لئے اس سلسلہ کو تسلیم کرنا ضروری ہے، کیونکہ ذات باری تعالیٰ کے بارے میں علم و معرفت کا واحد ذریعہ یہی انبیاء و رسل ہیں۔

---

[1] دیوان اوس بن حجر ص ۱۰

[2] دیوان الہذلیین ج ۱ ص ۱۲۹

الآخرة

الآخرۃ: کے لغوی معنی بعد والی، پچھلی اور اختتامی کے ہیں، مشتقات کے لحاظ سے یہ صفت کا صیغہ ہے، کلام عرب اور قرآن مجید دونوں میں یہ لفظ کثرت سے استعمال ہوا ہے، کلام عرب میں یہ اولیٰ یا دنیا کے مقابل کے طور پر آتا ہے، ابن منظور نے ثعلب کا قول نقل کیا ہے، "صفۃ الاولیات دخولہ و الآخرات خروجا"[1] وہ لوگ آنے میں سبقت کرتی ہیں اور جانے میں پیچھے ہوتی ہیں، اور دنیا کے بالمقابل اخروی زندگی کے لیے المثلم بن رباح المری نے بہت مناسب طریقہ سے استعمال کیا ہے:

انی تقسمت ما ملکت فجاعلٌ آخرۃ و دنیا تنفع[2]

قرآن مجید میں اس مادہ کے دوسرے مشتقات اپنے بنیادی لغوی معنی بمقابلہ اول یا اولیٰ بھی آئے ہیں، مگر لفظ آخرۃ صرف اصطلاحی مفہوم میں وارد ہوا ہے، اور اس کی تعداد ۱۱۵ ہے[3]۔

دنیا اور آخرت دونوں قرآنی اصطلاح ہیں، اول الذکر سے مراد اس عالم کی موجودہ زندگی ہے جس میں ہزاروں لاکھوں مخلوقات ایک نظام کے تحت زندگی گذار رہی ہیں، اور آخر الذکر سے مراد وہ زندگی ہے جو اس کے فنا ہو جانے کے بعد شروع ہوگی اور کبھی ختم نہ ہوگی۔

اسلامی عقائد میں توحید کے بعد ایمان بالآخرۃ کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے، کیونکہ موجودہ زندگی کی تمام کارگذاری اور اس کے نتائج کی اصل اور دائمی بنیاد آنے والی زندگی پر قائم ہے، اسی وجہ سے قرآن مجید کی آیات اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات میں اس

---

[1] لسان العرب بذیل مادہ آخر!

[2] الحماسہ ج ۲ ص ۲۲۶!

[3] بقرہ ۸۶، ۹۴، ۱۰۲، ۱۲۱، ۱۳۰، ۱۹۰، ۱۹۱، ۱۹۷، ۱۳۰، ۲۰۰، ۲۰۱، ۲۱۷، ۲۲۰!

عقیدے پر بہت زور دیا گیا ہے، اور اس کے اسکانات و واقعات پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔

اسلامی تعلیمات میں ایمان بالآخرۃ کا جو مفہوم بہت تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے،

اس کا خلاصہ یہ ہے۔

۱۔ ہر شخص اس بات پر یقین رکھے کہ جس طرح دنیا کی ہر چیز اپنی ایک عمر رکھتی ہے جس کے پورے ہو جانے کے بعد اس میں فساد رونما ہو جاتا ہے، اسی طرح اس نظام عالم کی بھی ایک عمر ہے جس کے تمام ہونے پر سارا عالم درہم برہم ہو جائے گا، اور اللہ تعالیٰ اس کی جگہ ایک دوسرا نظام برپا کر دیگا۔

۲۔ اس نظام کے بکھر جانے کے بعد اللہ تعالیٰ عدالت قائم فرمائیگا، جس میں ہر شخص کا حساب لیا جائیگا۔ انسان کو پھر اس دن ایک نئی زندگی ملے گی۔ اس کے تمام اعمال کا ٹھیک ٹھیک حساب ہوگا۔ اور وہاں ہر اچھے عمل کی اچھی جزا ملے گی اور ہر بُرے عمل کی بُری سزا دی جائے گی۔

۳۔ انسان کی دنیوی زندگی دراصل اس کی اخروی زندگی کا مقدمہ ہے، یہ زندگی عارضی ہے اور وہ پائیدار، یہ ناقص ہے اور وہ کامل، تمام اعمال کے پورے پورے نتائج اس عارضی زندگی میں مرتب نہیں ہوتے، ہر بیج جو یہاں بویا جاتا ہے اپنے فطری ثمرات کے ساتھ اس ناقص زندگی میں بارآور نہیں ہو سکتا، اس نقص کی تکمیل اس دوسری زندگی میں ہوگی، اور جو کچھ یہاں بے نتیجہ اور بے ثمر رہ گیا ہے وہ اپنے حقیقی نتائج اور ثمرات کے ساتھ وہاں ظاہر ہوگا، لہٰذا انسان کو اپنے اعمال و افعال کے محض ان ناتمام اور لب بوقات دھوکہ دینے والے نتائج پر نظر نہ رکھنی چاہیے، جو اس دنیوی زندگی میں مرتب ہوتے ہیں، اور نتائج کے اس مکمل سلسلے کا لحاظ کرتے ہوئے اپنے افعال کی قدریں متعین کرنی چاہئیں۔

یہ کامیابی اور ناکامی کا اصل معیار موجودہ زندگی کی خوشحالی و بدحالی نہیں ہے، بلکہ درحقیقت کامیاب انسان وہ ہے جو خدا کے آخری فیصلے میں کامیاب ٹھہرے، اور ناکام وہ ہے جو وہاں ناکام ہو جائے۔

لغوی اور لفظی کے لحاظ سے قرآن نے اس کے ابتدائی جاہلی تصور/معنی میں بظاہر کوئی اضافہ نہیں کیا ہے، بلکہ دونوں ادوار میں یہ لفظ ایک ہی مفہوم میں استعمال ہوتا رہا ہے، البتہ قرآن نے تصور آخرۃ کو بہت واضح اور مستحکم کیا ہے، عہد جاہلی میں اس پر دبیز گرد جم گئی تھی اور اس کا حقیقی تصور غلط فہمیوں کا شکار ہو گیا تھا۔

الاسلام

اسلام: مادہ س ل م سے باب افعال، سلم کے مندرجہ لغوی معنی قابل ذکر ہیں۔

(۱) ظاہری اور باطنی آلائشوں اور عیوب سے پاک ہونا، (۲) صلح و امان، (۳) سلامتی، (۴) اطاعت و فرمانبرداری

"سَلَمَ" "سَلُمَ" کا مفہوم انقیاد، اذعان، سپردگی، فرمانبرداری اور اطاعت ہے[۱]، ان میں سے پاک اور بے عیب ہونے کا معنی خاص طور سے قابل غور ہے، اسی مادے سے اسلام لازم اور متعدی دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ لفظ اسلام وہ تمام مفاہیم شامل ہیں جو اوپر مذکور ہیں پہلے معنی کی مناسبت سے اسلام کے معنی ہیں: عبادت، دین اور عقیدے کو اللہ تعالیٰ کے لئے خالص کرنا، نیز بمعنی استسلام، انقیاد، اطاعت اور فرمانبرداری وغیرہ سبھی کچھ اسلام کے مفہوم میں شامل ہے۔

کلام عرب میں "سَلَمَ" بہت مقبول عام لفظ ہے اور مذکورہ تمام معانی میں متعدد طریقوں سے آیا ہے،

(۱) اطاعت و فرمانبرداری کے مفہوم میں کسی کندی شاعر کا شعر ہے:

دعوت عشیرتی للسلم لما ۔۔۔ رأیتھم تولوا مدبرینا[۲]

(۲) سلامتی و دعا کے مفہوم میں یہ شعر نظیر بن سکتا ہے۔

وقفنا فقلنا ایہ سلم فسلمت ۔۔۔ فما کاف الا ردموھا بالحواجب[۳]

---

[۱] المفردات بذیل مادہ سلم؛ لسان العرب بذیل سلم، وتاج العروس بذیل مادہ

[۲] لسان العرب بذیل سلم

[۳] جمہرۃ اللغۃ بذیل سلم

(۳) چھٹکارا پانے اور آزاد ہونے کے مفہوم میں اعشیٰ کی یہ تعبیر بہت معنی خیز ہے:

فقاضت دموعی کفیض الغرو ب اما وکیفا واما انحدارا

کما اُسلم السلک من نظمہ لآلی منحدرات صغارا[1]

لغویین کا کہنا ہے کہ سلم سے اسلام تک یہ لفظ مختلف ارتقائی مراحل سے گذرا ہے۔ استاذ احمد امین نے اپنی کتاب فجر الاسلام میں اس لفظ کا گہرائی سے تجزیہ کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ "جب ہم مادہ سلم اور کلمۂ اسلام کے آغاز پر غور کرتے ہیں تو اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ اسلام کے معنی مسالمۃ کے ہیں جو جنگ وجدال کا ضد ہے، آپ قرآنی

وعباد الرحمن الذین یمشون علی الارض هونا واذا خاطبهم الجاهلون قالوا سلاما (الفرقان ۶۳)

رحمٰن کے (اصلی) بندے وہ ہیں جو زمین پر نرم چال چلتے ہیں اور جاہل ان کے منہ آئیں تو کہہ دیتے ہیں تم کو سلام

اس سلسلے میں ہماری بھرپور رہنمائی کرتی ہے، بعثت نبوی سے پہلے کے زمانے کو "جاہلیت" اور آپ کے عہد کو "اسلام" کیوں کہا گیا ہے، جاہلیت کے بنیادی عناصر جوش، سستی، تفاخرت، اور حماقت ہیں، اور صحیح بات یہ ہے کہ قبل از اسلام کا زمانہ انہی خصوصیات سے عبارت تھا، چنانچہ اس کا نام جاہلیت پڑ گیا، اس کے بالمقابل حلم وبردباری، خاکساری وفروتنی اور بھلائی کے کاموں میں مسابقت کا جذبہ جو اسلام کی روح ہے، اسی وجہ سے اس زمانے کا نام اسلام رکھا گیا،[2]

---

[1] جمہرۃ اللغۃ مادہ سلم

[2] فجر الاسلام ص ۶۹

قرآن مجید میں اسلام اور اس کے مشتقات متعدد بار آئے ہیں، جو لغوی مفہوم پر دلالت کرتے ہیں، اولین معنی اخلاص اور ظاہری و باطنی آلائشوں سے پاک ہونے کے مفہوم میں یہ آیات ہیں:

قال انه یقول انها بقرة لا ذلول تثیر الارض ولا تسقی الحرث مسلمة لا شیة فیها (البقرہ ۷۱)

موسیٰ نے جواب دیا: اللہ کہتا ہے کہ وہ ایسی گائے ہے جس سے خدمت نہیں لی جاتی، نہ زمین جوتتی ہے نہ پانی کھینچتی ہے، صحیح سالم اور بے داغ ہے۔

سورہ شعراء میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یہ دعا وارد ہوئی ہے،

ولا تخزنی یوم یبعثون، یوم لا ینفع مال ولا بنون، الا من اتی اللہ بقلب سلیم (الشعراء ۸۷-۸۹)

اور مجھے اس دن رسوا نہ کر جبکہ سب لوگ زندہ کر کے اٹھائے جائیں گے، جبکہ نہ مال کوئی فائدہ دے گا نہ اولاد، بجز اس کے کہ کوئی شخص قلب سلیم لیے ہوئے اللہ کے حضور حاضر ہو،

صلح و امان کے معنی میں درج ذیل آیات میں یہ لفظ وارد ہوا ہے،

فلا تهنوا وتدعوا الی السلم (محمد ۳۵)

پس تم بودے نہ بنو اور صلح کی درخواست نہ کرو،

وان جنحوا للسلم فاجنح لها وتوکل علی اللہ (الانفال ۶۱)

اے نبی! اگر دشمن صلح و سلامتی کی طرف مائل ہوں تو تم بھی اس کے لیے آمادہ ہو جاؤ۔

اطاعت و فرماں برداری کے مفہوم درج ذیل آیت سے استدلال کیا جا سکتا ہے:

بل هم الیوم مستسلمون (الصافات ۲۶)

ارے، آج تو یہ اپنے آپ کو (اور ایک دوسرے کو) حوالے کیے دے رہے ہیں۔

اور حوالگی و سپردگی کے مفہوم میں یہ آیت بہت واضح ہے:

اذ قال له ربه اسلم، قال اسلمت لرب العالمين (بقرہ ۱۳۱)	جب کہ اس کے رب نے حکم دیا کہ اپنے آپ کو حوالہ کر دے، اس نے کہا میں نے اپنے آپ کو پروردگار عالم کے حوالہ کر دیا۔

اسلام کی لغوی تحقیق میں حدیث پاک کے ان الفاظ سے بھی مدد لی جاتی ہے،

المسلم من سلم المسلمون من لسانه ويده[1]	مسلم وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔

اسلام: قرآن مجید کی سب سے اہم اور مقبول اصطلاح ہے، یہ دین حق کا عَلَم ہے، اور قرآن مجید کی دیگر اصطلاحات اسی کی شاخ ہیں۔ لفظ اسلام کا اصطلاحی معنی اس کے لغوی معنوں ہی سے نکلا ہے، اور دونوں کا باہم مضبوط تعلق ہے، ابن منظور نے اسلام کا اصطلاحی مفہوم یہ بیان کیا ہے:

الاسلام من الشريعة اظهار الخضوع و
اظهار الشريعة والتزام ما أتى به النبي
صلى الله عليه وسلم وبذلك يحقن الدم
ويستدفع المكروه[2]

حدیث شریف میں اسلام کے اصطلاحی و شرعی معنوں کی تشکیل و تفصیل اس فرمان نبوی میں ہے جو مسند احمد

---

[1] البخاری، کتاب الایمان، باب المسلم من سلم المسلمون؛

[2] لسان العرب، ذیل سلم؛

میں حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، "ایک دن ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے تھے کہ ناگاہ ایک شخص نمودار ہوا، .... اور وہ اپنی ہتھیلیاں آپؐ کی رانوں پر رکھ کر عرض کرنے لگا، اے محمدؐ مجھے بتائیے کہ اسلام کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا، اسلام یہ ہے کہ تو اس امر کی شہادت دے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمدؐ اللہ کے رسول ہیں، اور یہ کہ نماز قائم کرے، زکوٰۃ ادا کرے، رمضان کے روزے رکھے، اور اگر استطاعت ہو تو بیت اللہ کا حج کرے، اس شخص نے کہا، آپؐ نے درست فرمایا، حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ میں اس بات پر حیرت ہوئی کہ یہ شخص خود ہی سوال کرتا ہے اور خود ہی اس کی تصدیق بھی کرتا ہے، ..... پھر اس نے آپؐ سے ایمان اور احسان کے بارہ میں پوچھا آپؐ نے اس کا بھی جواب دیا اور اس نے تصدیق کی، آخر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا اے عمر! جانتے ہو یہ سائل کون تھا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا، اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتا ہے، اس پر آپؐ نے فرمایا، یہ حضرت جبرئیل تھے۔[1] اس طویل روایت کو آپ کے صاحبزادے حضرت عبداللہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت ہی مختصر الفاظ میں روایت کی ہے:

بنی الاسلام علی خمس: شهادة أن لا إله إلا الله وأن محمداً رسول الله وإقام الصلوٰة وإيتاء الزكوٰة والحج وصوم رمضان[2]	اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے (۱) اس بات کی گواہی کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، اور حضرت محمدؐ اللہ کے رسول ہیں، (۲) نماز قائم کرنا (۳) زکوٰۃ ادا کرنا (۴) حج کرنا (۵) اور رمضان کے روزے رکھنا۔

---

[1] مسند احمد ۱/۲۲؛ اس کے علاوہ الفاظ میں معمولی تغیر کے ساتھ صحاح ستہ کے سبھی مجموعوں میں موجود ہے۔ دیکھئے: بخاری، کتاب الایمان، باب الایمان وقول النبی بنی الاسلام علی خمس، وصحیح مسلم، کتاب الایمان کی پہلی حدیث۔ [2] حوالہ مذکور۔

اسلام کا اصطلاحی مفہوم مذکورہ بالا آیات و احادیث سے خود بخود متعین ہو جاتا ہے، کہ اسلام پانچ بنیادی عقائد اور پانچ بنیادی فرائض کا دل و زبان سے تسلیم کر لینے کا نام ہے۔ جو شخص ان باتوں کو تسلیم کر لیتا ہے، مسلم کہلاتا ہے۔ ابن منظور نے 'مسلم' کی تعریف میں اس کی قدرے وضاحت کی ہے، کہ "مسلم وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے حکم کے سامنے سر تسلیم خم کرنے والا ہو، اور صرف اسی کی عبادت کا قائل ہو"، پھر اس کی مزید تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "مکمل ایمان والا مسلمان صرف وہی ہے جو ظاہری احکام و ارکان شریعت کی پوری پوری پابندی کے ساتھ دل سے بھی ان میں کامل یقین رکھتا ہو، مگر جو شخص محض جان بچانے کے لئے یا کسی اور دنیوی مصلحت کی خاطر خود کو مسلم ظاہر کرے، اور حقیقت میں اس پر ایمان نہ لائے، اس کا حکم بھی وہی ہوگا جو ایک مسلم کا ہے"[1]

لفظ اسلام کی اس تحقیق سے یہ بات واضح ہوگئی کہ سلم اور اس کے مشتقات کلام عرب میں پہلے سے مروج تھے، اور اس کے لغوی مفہوم میں بتدریج ارتقاء ہوتا رہا ہے، یہاں تک کہ اس کا اصطلاحی مفہوم لغوی معنوں سے بہت قریب ہے۔ مگر دین حق کا تکلم بن جانے کے بعد اپنی شرائط و خصوصیات کے ساتھ جو جامع مفہوم ابھرا ہے، زمانہ جاہلیت میں اس کا کوئی تصور بھی نہ تھا، اس لفظ کی دوسری بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہ اپنے ساتھ زبان و ادب کی بہتری اور ترقی کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ اس نے مختلف زبانوں کو نئے فنون عطا کئے، نئے نئے اسالیب ایجاد کئے اور سیکڑوں اصطلاحات عطا کیں، اس طرح عربی زبان کا ارتقاء و ارتقاء بھی دراصل "اسلام" کا مرہون منت ہے۔

---

[1] لسان العرب بذیل مادہ، نیز دیکھئے: تفسیر روح المعانی ۱۲۶، ۱۳۳؛ و تفسیر المراغی ۲۶ : ۱۲۶؛

الایمان

الایمان: اَمْنٌ بے خوفی، اطمینان، ابن فارس نے لکھا ہے کہ اس کے بنیادی معنی (۱) خیانت کی ضد (۲) اطمینانِ قلب (۳) اور تصدیق کرنے کے ہیں[1]۔ اَمَنَ: کسی کو بے فکر اور مطمئن کر دینا، دوسرے کو امن دینا، اس کی حفاظت کی ذمہ داری اپنے سر لینا، اِئتمان: کسی پر بھروسہ اور اعتماد کرنا، کسی کو امانت دار اور محافظ سمجھنا، امانۃ: وہ چیز جو کسی کے بھروسہ پر دے دی جائے[2]، امین بے خوف و مطمئن جسے قابلِ اعتماد سمجھا جائے، بلدِ امین، جس شہر میں امن و حفاظت ہو، رسول امین، قابلِ اعتماد پیغمبر، اس لفظ کا استعمال کلامِ عرب میں انہی معانی میں تھا۔

اَمَنَ کا صلہ لام ہو تو اس کے معنی بات ماننے کے ہوتے ہیں، سورہ بقرہ میں بنی اسرائیل کے ضمن میں ہے لن نؤمن لک (بقرہ ۵۵) ہم تمہاری بات نہیں مانیں گے، اور جب اس کا صلہ ب ہو تو اس کے معنی ایمان لانے کے ہوتے ہیں، کُلٌّ آمَنَ باللّٰہ (بقرہ ۲۸۵) (سب اللہ پر ایمان لائے) اَمَنَ کے جو مختلف معانی و استعمالات اوپر بیان کئے گئے ہیں، 'ایمان' کے مفہوم میں تمام معانی شامل ہیں، یعنی (۱) یقین کرنا، تسلیم کرنا، انکار نہ کرنا (۲) تصدیق کرنا، تکذیب نہ کرنا، (۳) اعتماد اور بھروسہ کرنا، (۴) بات ماننا، اطاعت کرنا، اور سرِ تسلیم خم کر دینا۔

ایمان: قرآن کی بہت ہی اہم اصطلاح ہے، یہ کفر کی ضد ہے۔ قرآن کی رو سے پانچ بنیادی حقیقتوں کو زبان و قلب سے تسلیم کرنے کا نام 'ایمان' ہے:

لیس البرّ ان تولوا وجوھکم قبل	نیکی یہ نہیں ہے کہ تم چہرے مشرق کی طرف کرنے
المشرق والمغرب ولکن البرّ من آمن	یا مغرب کی طرف بلکہ نیکی یہ ہے کہ آدمی اللہ کو اور

---

[1] ابن فارس، مقاییس اللغۃ بذیل مادہ [2] محیط المحیط بذیل مادہ

والیوم الآخر باللہ والملائکۃ والکتاب والنبیین	یوم آخر اور ملائکہ کو اور اللہ کی نازل کی ہوئی
(البقرہ ۱۷۷)	کتاب اور اس کے پیغمبروں کو دل سے مانے۔
ومن یکفر باللہ وملائکتہ وکتبہ ورسلہ	جس نے اللہ اور اس کے پیغمبروں اور اس کی کتابوں
والیوم الآخر فقد ضل ضلالاً بعیدا	اور اس کے رسولوں اور روز آخرت سے کفر کیا، وہ
(النساء ۱۳۶)	گمراہی میں بھٹک کر بہت دور نکل گیا۔

ان آیات سے اصطلاحی ایمان کا یہ مفہوم متعین ہوتا ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی وحدانیت، انبیاء کرام کی بعثت، قرآن مجید کی حقانیت، ملائکہ کے وجود اور یوم آخرت پر یقین و اطمینان کا دل و زبان سے اقرار کرے وہ صاحب ایمان یا مومن ہو جائیگا، قرآن نے ایسے ہی لوگوں کو جگہ جگہ ایہا الذین آمنوا یا مومن/مومنون کے نام سے خطاب کیا ہے۔

قرآن مجید کی بعض آیات سے ایمان اور اسلام الگ الگ دو مفہوم ظاہر ہوتے ہیں،

قالت الاعراب آمنا قل لم تؤمنوا	اہل بدو نے کہا ہم ایمان لائے، ان کو بتا دو
ولکن قولوا اسلمنا ولما یدخل الایمان	کہ تم ایمان نہیں لائے، ہاں یوں کہو کہ ہم نے اطاعت
فی قلوبکم (الحجرات ۱۴)	قبول کر لی، اور ابھی ایمان تمہارے دلوں کے اندر داخل
	نہیں ہوا ہے۔

حدیث جبرئیلؑ جو لفظ "اسلام" کی بحث میں گذر چکی ہے، جس میں آپ نے ایمان کا مطلب یہ بتایا ہے کہ "ایمان یہ ہے کہ تو اللہ پر اور اس کے فرشتوں پر اور اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر اور آخرت پر اور نیک و بد تقدیر پر ایمان لائے" سے بظاہر ایمان و اسلام دو الگ الگ چیزیں محسوس ہوتی ہیں۔

قرآن و حدیث میں ایمان و اسلام کے استعمالات کا استقصاء کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مترادف الفاظ ہیں، لیکن کبھی کبھی الگ معنوں میں بھی بولا جاتا ہے، ایسی صورت میں اسلام ظاہری اقرار و عمل اور ایمان قلبی تصدیق کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، اس لحاظ سے اسلام و ایمان کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا، ان دونوں لفظوں میں وہی فرق ہے جس کو واضح کرنے کے لئے علم منطق میں عام و خاص کی اصطلاح وضع کی گئی ہے۔

Ds. 2659

الکفر والکافر

الکفر: کے بنیادی معنی چھپانے اور ڈھانپنے کے ہیں، لبید کا شعر ہے:

یعلو طریقۃ متنہا متواتر فی لیلۃ کفر النجوم غمامہا [1]

رات کو بھی کافر کہتے ہیں کیونکہ اس کی تاریکی تمام چیزوں پر پردہ ڈال دیتی ہے، لبید ہی کا اس مفہوم میں بھی ایک شعر ہے:

حتی اذا ألقت یدا فی کافر وأجن عورات الثغور ظلامہا [2]

دریا اور سمندر چونکہ اپنی اندرونی چیزوں کو چھپا لیتے ہیں، اس لئے انہیں بھی کافر کہا جاتا ہے، ملتمس کا شعر ہے:

ألقیتہا بالثنی فی جنب کافر کذلک أفنی کل قط مضلل

رضیت لہا بالماء لما رأیتہا یحول لہا التیار فی کل جدول [3]

کسان کے لئے بھی کافر کا لفظ بولا جاتا ہے، کیونکہ وہ بیج کو مٹی میں چھپا دیتا ہے۔ آیت قرآنی أعجب الکفار نباتہ (الحدید ۲۰) کی ایک تفسیر یہ بھی ہے کہ اس آیت میں "کفار" سے مراد کاشتکار ہے [4]۔ اسی طرح اس مٹی کو جس پر گرد یا راکھ چھا جائے۔ "رماد مکفور" کہتے ہیں:

---

[1] دیوان لبید ۲۲۳؛

[2] حوالہ مذکور ۲۳۱؛

[3] الشعر والشعراء ج ۱ ص ۱۱۲؛

[4]

مذکورہ بالا حوالوں میں "کفر" صرف مادی محسوس اشیاء کے چھپانے کیلئے استعمال ہوا ہے، مگر اس کے مدلولات کا دائرہ اس سے کہیں زیادہ وسیع ہے، یہ غیر مادی و غیر محسوس اشیاء کو چھپانے کے لئے بھی کلام عرب میں خوب استعمال ہوا ہے، چنانچہ نعمتوں کو چھپانا یعنی ناشکری کرنا، دلائل کو چھپانا یعنی کٹ حجتی کرنا کے لئے "کفر و کفور" ہی استعمال ہوتا ہے۔ اعشیٰ کا شعر ہے:

فلا تجحدنی کافراً لک نعمۃ ۔۔۔ علی شہید شاھد اللہ فاشھد[1]

اس سے بھی آگے بڑھ کر اپنے رب کی نعمتوں کا انکار کرنے اور چھپانے کے لئے بھی عرب کفر ہی استعمال کرتے تھے، جو دراصل ایمان کا ضد ہے، اگرچہ اس زمانہ میں "ایمان باللہ" کا صحیح مشرکانہ آلائشوں سے بالکل آلودہ ہوگیا تھا، پورے معاشرے میں انگلیوں پر گنے جانے امیہ بن ابی الصلت اور ورقہ بن نوفل جیسے چند حضرات ہی تھے جن کے اندر حقیقی ایمان کی کچھ رمق باقی تھی، اور ان کی زندگیاں مشرکانہ خرافات سے کسی قدر محفوظ تھیں۔ ورقہ بن نوفل ہی کے اشعار ہیں:

ارجو بالذی کفروا جمیعا ۔۔۔ الی ذی العرش ان سفلوا عروجا

وصل امر السفالۃ غیر کفر ۔۔۔ بمن یختار من سمک البروجا

فان یبقوا وابق تکن امور ۔۔۔ یضج الکافرون بہا ضجیجا

وان اھلک فکل فتی سیلقی ۔۔۔ من الاقدار تسلفہ خروجا[2]

ورقہ بن نوفل کے مذکورہ اشعار میں "کفر" جن معنوں میں استعمال ہوا ہے بعینہ یہی مفہوم

---

[1] دیوان الاعشیٰ ص ۲۲۹؛

[2] سیرۃ ابن ہشام ج ۱ ص ۱۹۲؛

قرآن اصطلاح کا بھی ہے۔ اس توجیہ پر تقریباً تمام اہل لغت متفق ہیں۔

قرآن مجید میں تقریباً سارے پانچ سو مقامات پر کفر اور اس کے مشتقات آتے ہیں۔ اور لغوی و اصطلاحی دونوں معنوں میں استعمال ہوتے ہیں۔ جن کی تعیین مفسرین نے سیاق و سباق کے لحاظ سے موقعے کی ہے مثلاً ناشکری کا معنی درج ذیل آیت میں بالکل واضح ہے:

قال هذا من فضل ربي ليبلوني	وہ پکار اٹھا یہ میرے رب کا فضل ہے
أأشكر أم أكفر	تاکہ وہ مجھے آزمائے کہ میں شکر کرتا ہوں یا
(النمل ۴۰)	کافر نعمت بن جاتا ہوں۔

گناہوں کو مٹانے اور چھپانے کے معنی میں متعدد مقامات پر یہ الفاظ آئے ہیں:

والذين آمنوا وعملوا الصالحات لنكفرن	اور جو لوگ ایمان لائیں گے اور نیک اعمال
عنهم سيئاتهم	کریں گے ان کی برائیاں ہم ان سے دور
(عنکبوت ۷)	کر دیں گے۔

اور جہاں تک متعین اصطلاحی مفہوم ضد ایمان کا تعلق ہے۔ اس کی مثالیں قرآن مجید میں صفحہ صفحہ پر موجود ہیں۔ سورہ بقرہ کی چھٹی آیت ہے:

إن الذين كفروا سواء عليهم أأنذرتهم	جن لوگوں نے (ان باتوں کو تسلیم کرنے سے)
أم لم تنذرهم لا يؤمنون	انکار کر دیا، ان کے لئے یکساں ہے خواہ تم
(البقرہ ۶)	انہیں خبردار کرو یا نہ کرو، بہرحال وہ ماننے والے
	نہیں ہیں۔

قرآن کی رو سے کفر 'ایمان' کا ضد ہے، کفر کی جو اصطلاحی تعریف علماء فقہ و کلام میں مشہور اور متفق علیہ ہے وہ یہ ہے:

هو جحد كل ما ثبت عن النبي صلى الله عليه وآله وسلم ادعاؤه ضرورة[1]

کسی بھی ایسی چیز کا انکار کفر ہے جس کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بداہۃً ثابت ہو کہ آپ نے اس کا دعویٰ فرمایا تھا۔

توحید، رسالت، آپ پر سلسلۂ نبوت کا ختم ہونا، آخرت کی زندگی، پانچوں نماز میں زکوٰۃ، حج اور رمضان کے روزے، شراب اور زنا کی حرمت وغیرہ، یہ سب چیزیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یقینی اور بدیہی طور پر ثابت ہیں، اس قسم کی جس چیز کا بھی انکار کیا جائے وہ کفر ہے، اور انکار کرنے والے کو کافر کہا جاتا ہے۔

جمہور علماء اسلام کا اس پر اتفاق ہے کہ اصولاً کفر "کا تعلق عقیدہ" سے ہے، اگر ایک شخص عمل میں کمزور ہے مگر اسلام کے اساسی عقائد پر ایمان رکھتا ہے تو وہ کافر نہیں ہوگا۔

لفظ کفر کے اس تجزیاتی مطالعہ سے یہ بات واضح ہوئی کہ زمانہ قبل از اسلام سے ہی کفر مختلف معانی میں استعمال ہوتا رہا ہے، یہاں تک کہ قرآن مجید نے جو اصطلاحی مفہوم متعین کیا وہ بھی اس زمانہ میں مروج تھا، البتہ اسلام نے اس کے صحیح تصور کو واضح کیا ہے۔ اب کفر کا استعمال زیادہ تر اسی معنی میں ہوتا ہے جو قرآن نے متعین کیا ہے، اور جو اس کا اصطلاحی معنی ہے۔

---

[1] ابن حمام، المسایرہ ص ۱۴۹

الشرک والمشرک

الشرک: کے بنیادی معنی ہیں چھٹے رہنا، غلط ملط ہو جانا، شارکت فلاناً کے معنی ہیں، میں فلاں کا ساتھی ہو گیا، اور اشترکت الامر کے معنی ہیں معاملہ گڈمڈ ہو گیا، مشارکۃ کے معنی ہیں ایک کا دوسرے کے ساتھ کسی کام میں شریک ہو جانا، انہی معنوں میں یہ الفاظ کلام عرب میں مستعمل ہوتے ہیں، مال غنیمت میں شریک کرنے کے مفہوم میں ابن منظور نے کسی شاعر کا یہ شعر نقل کیا ہے۔

علی کل نضد الفقرین مقلص وجرداء یأبی ربہا أن یشارکا [1]

شریک بمعنی ساجھی، حصہ دار مسیب نے اپنے کلام میں استعمال کیا ہے

شرکا بماء الذوب یجمعہ فی طود الیمن فی قری قسر [2]

مشترک، ملا جلا اور مخلوط کے معنی میں ابن الاعرابی کا شعر ہے

ولا یستوی المرآن، ھذا ابن حرۃ وھذا ابن أخری ظھرھا مشترک [3]

جاہلی ادب میں یہ لفظ صرف انہی معنوں میں مستعمل تھا، قرآن مجید نے اسے توحید کے بالمقابل ایک اصطلاح کا درجہ دے کر، بہت اوپر اٹھایا ہے اور اس لغوی معنی کو باقی رکھتے ہوئے ایک نئے مفہوم سے آراستہ کیا ہے۔ قرآن مجید کی اصطلاح میں شرک سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات، صفات اور اعمال میں کسی کو شریک ٹھہرانا ہے۔

قرآن مجید میں شرک کے بعض مشتقات لغوی مفہوم میں بھی وارد ہوئے ہیں۔

---

[1] لسان العرب، بذیل مادہ شرک۔

[2] حوالہ مذکور

[3] حوالہ مذکور

شرکاء فھم شرکاء فی الثلث (نساء ۱۲) (لھم فیکم شرکاء (انعام ۹۴) واشرکہ فی امری (طہ ۳۲) لیکن زیادہ تر مواقع پر اصطلاحی معنی میں ہی وارد ہوا ہے بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ یہ قرآن مجید کے مرکزی مباحث میں ایک اہم موضوع ہے، اور قرآن مجید کا تقریباً ایک تہائی حصہ توحید و شرک کے مضامین پر مشتمل ہے۔

قرآن مجید نے شرک کو سب سے بڑا جرم قرار دیا ہے[1]، اور واضح ترین الفاظ میں یہ یہ حکم صادر کیا ہے کہ 'شرک' کی کسی صورت میں بخشش نہیں ہوگی[2]، وہ ہمیشہ جہنم کی آگ میں جلے گا[3]۔

[1] لقمان ۱۳؛ [2] نساء ۴۸؛ [3] آل عمران ۱۵۱

النفاق والمنافق

النفاق: کلمہ نفق کے عرب میں متعدد معانی رائج تھے، اس کا بنیادی معنی رواج یعنی کساد کا ضد ہے، کہتے ہیں "انفق البیع نفاقا" خوب خوب بکری ہوئی، اسی معنی میں مسدوس بن خباب کا شعر ہے:

عبد ینفق نفسہ ولیس مثلہا ولیقول انی ابرز ترا ع[1]

پھر اسی معنی سے ترقی کر کے تیزی سے گذرنے کے مفہوم میں استعمال ہونے لگا، علقمہ بن عبدۃ کے شعر سے یہ مفہوم مترشح ہوتا ہے:

فلا تزیدہ فی مشیہ نفق ولا الزفیف دون الشد مسؤوم[2]

نفوق کے معنی موت کے ہیں، نفق الفرس والدابۃ وسائر البھائم ینفق نفوقا کا مطلب ہے کہ گھوڑا، دنبہ اور تمام جانور مر گئے، اس مفہوم پر ابن منظور نے ثعلب کے اس شعر سے استدلال کیا ہے۔

فما أشیاء نشربہا بمال فان نفقت فما کسد ما تکون۔[3]

"النفق" ایسی سرنگ کو کہتے ہیں جس کے داخل ہونے اور نکلنے کے دونوں راستے کھلے ہوں، "النفقۃ" جنگلی چوہے کی بل کو کہتے ہیں جو دونوں طرف سے کھلی ہوتی ہے۔ اپنے گھوڑے کا وصف بیان کرتے ہوئے امرؤالقیس نے درج ذیل شعر میں چوہیا

---

[1] اساس البلاغۃ، بذیل مادہ نفق؛

[2] المفضلیات ص ۴۰۰

[3] لسان العرب بذیل مادہ

کا بل سے استعارہ کیا ہے:

خفاهن من النافقن كأنما خفاهن ودق من عشيّ مُحلّب [1]

قرآن مجید میں نفق کے سیکڑوں مشتقات آتے ہیں، اور اس سے نفاق اور منافق کی دو اہم اصطلاحات بھی نکلی ہیں۔ نفاق کی اصطلاحی تعریف امام راغب اصفہانی نے اس طرح کی ہے:

الدخول فی الشرع من باب والخروج عنه من باب۔ [2]

دین میں ایک دروازے سے داخل ہونے اور دوسرے سے نکل جانے کا نام نفاق ہے۔

قرآن مجید نے منافق کا یہ طرز عمل بتایا ہے کہ:

واذا لقوا الذین آمنوا قالوا آمنا واذا خلوا الی شیاطینهم قالوا انا معکم انما نحن مستهزءون (البقرہ ۱۴)

وہ لوگ جب مسلمانوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے اور جب اپنے دوست کافروں سے علیحدگی میں ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم تو تمہارے ساتھ ہیں، مسلمانوں سے تو ہم محض ہنسی مذاق کرتے ہیں۔

اس آیت کے علاوہ دوسرے مقامات پر بھی قرآن مجید میں منافقین کے کردار کا بہت تفصیل سے ذکر آیا ہے۔ "المنافقون" کے نام سے پوری ایک سورہ میں ان کے دورخے کردار کی بہت اچھی طرح وضاحت کی گئی ہے۔

---

[1] دیوان امرئ القیس ص ۵۱

[2] المفردات بذیل مادہ

نفق و نفاق کے اس تجزیہ سے یہ بات واضح ہوتی کہ کلام عرب میں یہ لفظ متعدد معنوں میں مروج تھا، یہاں تک کہ اس کا جو اصطلاحی مفہوم ہے اس سے قریب تر معنی کا بھی رواج تھا، جیسے کہ طرفہ کے ایک شعر میں ہے:

وأما رجال نافقوا في إخائهم ولست إذا أحببت حرا أنافقه[1]

قرآن مجید نے ایک مخصوص انسانی طبقہ کے عمل و شخصیت سے منسوب کر کے ایک مخصوص معنی پہنا دیا ہے، جس کا جاہلی ادب میں بظاہر کوئی تصور نہ تھا، اس طرح قرآن مجید نے ادب عربی کو ایک نئے لفظ اور نئی اصطلاح سے آراستہ کیا۔

[1] دیوان طرفہ ص ۲۲۳؛

الفسق والفاسق

الفسق: مادہ ف س ق؛ لغت میں کھجور کا پک کر چھلکے سے نکلنا فسق کہلاتا ہے، چوہیا کو "فویسقہ" اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ اپنی بل سے چھلکے سے نکل آتی ہے، یہ لفظ اور اس کے مشتقات جاہلی ادب میں بہت کم استعمال ہوئے ہیں، یہاں تک کہ ابن الاعرابی کا کہنا ہے کہ دورِ جاہلیت کی نظم و نثر میں "فاسق" ایک بار بھی نہیں آیا ہے، جبکہ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ عربی الاصل ہے۔[1]

قرآن مجید میں فسق، فسوق، فاسق اور اس کے دوسرے مشتقات بکثرت استعمال ہوئے، استعمالاتِ قرآن کے بعد یہ لفظ عام ہوا، اور ادبا عرب کی زبان پر چڑھا۔ قرآنی آیات کے تتبع سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سیاق و سباق کے لحاظ سے مختلف معانی میں استعمال ہوا ہے، آیت قرآنی "افمن کان مؤمنا کمن کان فاسقا" (السجدہ ۱۸) (بھلا کہیں یہ ہو سکتا ہے کہ جو شخص مومن ہو وہ اس شخص کی طرح ہو جائے جو فاسق ہے) میں مومن کو فاسق کا ضد بتایا گیا ہے، اسی طرح سورہ توبہ کی آیت ۶۷ "ان المنافقین ھم الفاسقون" میں منافقین کے لیے فاسق آیا ہے، سورہ بقرہ کی درج ذیل آیت میں کفار و مشرکین کو صاف صاف فاسق کہا گیا ہے:

ولقد انزلنا الیک آیات بینات	اور ہم نے تمہاری طرف ایسی آیات نازل
وما یکفر بھا الا الفٰسقون	کی ہیں جو صاف صاف حق کا اظہار کرنے
(بقرہ ۹۹)	والی ہیں، اور ان کی پیروی سے صرف وہی
	لوگ انکار کرتے ہیں جو فاسق ہیں۔

فاسق کی اصطلاحی تعریف میں بڑا اختلاف پایا جاتا ہے، ایک تعریف یہ ہے کہ

---

[1] لسان العرب بذیل مادہ فسق؛

من خرج عن بحر الشرع — جو شریعت کی حد سے نکل جائے فاسق ہے۔

کافر کو بھی فاسق اسی بنا پر کہا جاتا ہے کہ وہ شریعت کو بھی نہیں مانتا اور عقل و فطرت کے تقاضوں سے بھی بے نیاز ہو جاتا ہے، تھانوی کے نزدیک "فسق" کے معنی "عدم اطاعۃ امر اللہ" یعنی اللہ تعالیٰ کے حکم کی اطاعت نہ کرنا ہے، اور اس میں کافر و گنہگار مسلمان دونوں شامل ہیں [1]۔ زیادہ مقبول تعریف یہ ہے کہ "اصل فاسق وہ ہے جو مسلمان ہو کر تمام یا بعض احکام شریعت کی خلاف ورزی کرے، بقول بعض وہ مسلمان جو کبیرہ کا ارتکاب کرے یا گناہ صغیرہ کا اگر اس پر اصرار کرتا ہے تو فاسق ہے۔ امام راغب کا کہنا ہے کہ فاسق کی اصطلاح منافق اور کافر کے مقابلہ میں زیادہ وسیع ہے، اور اس کے دائرہ میں سب آتے ہیں، جبکہ مذکورہ الفاظ کا ایک محدود دائرہ ہے [2]۔ اس کی سب سے اچھی تشریح صاحب الاشباہ والنظائر نے کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں "فسق کی چھ قسمیں ہیں: (۱) معصیت یعنی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی تعلیمات کا انکار کرنا، (۲) توحید کا انکار کرنا اور شرک میں مبتلا رہنا، (۳) دینی امور میں نافرمانی کی راہ اختیار کرنا، (۴) جھوٹ بولنا، (۵) گالم گلوچ کرنا، (۶) برائیوں میں ڈوبے رہنا [3]۔ احادیث میں بھی یہ لفظ بکثرت آیا ہے، صاحب الاشباہ نے انہی مبارک اقوال کی روشنی میں تشریح کرنے کی کوشش کی ہے۔

---

[1] تھانوی، کشاف اصطلاحات الفنون

[2] المفردات بذیل مادہ

[3] الاشباہ والنظائر ص ۳۲۹-۳۳۰؛

الظلم والظالم لنفسه

الظلم: کے بنیادی معنی ہیں کسی دوسرے کی ملکیت میں بے جا تصرف کرنا، حد سے تجاوز کرنا۔ امام راغب نے لکھا ہے کہ "ظلم کے معنی ہیں کسی چیز کو اس کے مخصوص مقام پر نہ رکھنا، کسی کا توازن بگاڑ دینا۔"[1] ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی تاریکی اور حد سے تجاوز کر کے کسی چیز کو بے جگہ رکھ دینا بتائے ہیں[2]۔ یہ تمام معانی ایک ہی اصل کی طرف پلٹتے ہیں جسے زیادتی و تجاوز کے الفاظ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ جاہلی ادب کا یہ بہت مقبول لفظ ہے اور مذکورہ بالا معنی بطور اصطلاح استعمال ہوتا رہا ہے۔ زہیر بن سلمی کا شعر ہے:

جریءٌ متی یظلم یعاقب بظلمه سریعاً وإلا یُبدَ بالظلم یظلم[3]

اور ضبیعم الاسدی نے بھی اسی مفہوم میں کہا ہے:

اذ هو لم یخفنی فی ابن عمی وان لم القه الرجل الظلوم[4]

قرآن مجید میں ظلم اور اس کے مشتقات تین سو سے زیادہ مرتبہ آئے ہیں، اور ہر جگہ جور زیادتی اور تجاوز کے معنی ہی مراد ہیں، اس کا اسم فاعل "ظالم" ہے جو ظلم ڈھانے والے کے لئے بولا جاتا ہے۔ قرآن نے متعدد مواقع پر "الظالم لنفسه" کی اصطلاح استعمال کی ہے، اس سے مراد وہ انسانی طبقہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے احکام کو نہیں مانتا، اس میں کافر، مشرک، فاسق اور منافق سبھی شامل ہیں، اس کو "ظالم لنفسه" اس وجہ سے کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے

---

[1] المفردات بذیل مادہ۔ [2] ابن فارس، بذیل مادہ؛

[3] دیوان زہیر ص ۸۹؛

[4] لسان العرب بذیل مادہ ظلم؛

جو فہم و فراست عطا فرمائی ہے اس کا تقاضا ہے کہ وہ حق کو پہچانے اور حق کو حق کی جگہ پر باقی رہنے دے، مگر وہ حق کو باطل سے گڈمڈ کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے احکام و تعلیمات کو صحیح جگہ پر باقی نہیں رہنے دیتا، اس لیے وہ دراصل اپنی عقل، ایمان اور اپنے مستقبل پر ظلم ڈھاتا ہے۔ ایسے لوگوں کے لیے قرآن مجید میں سخت وعیدیں آئی ہیں، ہر ایک مقام پر ظالم قوموں کے مظالم کی داستان سنانے کے بعد ان کا انجام قرآن نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

وما ظلمنٰهم ولٰكن ظلموا انفسهم فما اغنت عنهم الهتهم التي يدعون من دون الله من شيء لما جاء امر ربك وما زادوهم غير تتبيب. (ھود ۱۰۱)	ہم نے ان کے اوپر ظلم نہیں کیا، انہوں نے آپ ہی اپنے اوپر ستم ڈھایا، اور جب اللہ کا حکم آگیا تو ان کے وہ معبود جنہیں وہ اللہ کو چھوڑ کر پکارا کرتے تھے، ان کے کچھ کام نہ آسکے، اور انہوں نے ہلاکت و بربادی کے سوا انہیں کچھ نہ دیا۔
ان الذين كفروا وظلموا لم يكن الله ليغفر لهم ولا ليهديهم طريقا، الا طريق جهنم خٰلدين فيها (النساء ۱۶۸)	اس طرح جن لوگوں نے کفر و بغاوت کا طریقہ اختیار کیا اور ظلم و ستم پر اتر آئے، اللہ ان کو ہرگز معاف نہ کرے گا، اور انہیں کوئی راستہ بجز جہنم کے راستہ نہ دکھائے گا۔ جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔

ظلم کے الفاظ حضرات انبیاء کرام نے بعض دفعہ اپنی ذات کے لیے بھی استعمال کیے ہیں، مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام نے قبطی کے قتل کے بعد اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کی

رب اني ظلمت نفسي فاغفر لي فغفر له (القصص ۱۶)	اے رب میں نے اپنے نفس پر ظلم کر ڈالا میری مغفرت فرما دے، چنانچہ اللہ نے اس کی مغفرت فرما دی۔

اسی طرح حضرت یونس علیہ السلام نے قوم سے ناراض ہو کر جب راہ فرار اختیار کی اور مصیبت

میں گھر گئے تو یہ دعا کی:

لا الہ الا انت سبحانک انی کنت من الظالمین۔	نہیں ہے کوئی معبود مگر تو، پاک ہے تیری ذات، بے شک میں نے قصور کیا۔

(الانبیاء ۸۷)

مگر صحیح بات یہ ہے کہ زیادہ تر اس کا استعمال گناہ گاروں کے لیے ہی ہوا ہے۔ یہاں تک سب سے بڑے گناہ "شرک" کو "عظیم ظلم" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ (لقمان ۱۳) اور کافروں کے بارہ میں ایک جگہ آیا ہے:

والکافرون ھم الظالمون	اور ظالم اصل میں وہی ہیں جو کفر کی روش
(البقرہ ۲۵۴)	اختیار کرتے ہیں۔

اس آیت کے ذیل میں صاحب تفسیر المنار نے حضرت عطاء کی یہ معنی آفرینی نقل کی ہے:

الحمد للہ الذی قال "الکافرون ھم الظالمون" ولم یقل الظالمون ھم الکافرون یعنی انہ لا یکاد یسلم امرء من ظلم لنفسہ او لغیرہ فلو کان کل ظالم کافراً اھلک الناس۔[1]	اللہ تعالیٰ کے شکر و ستائش ہے جس نے ارشاد فرمایا کہ کافر ہی ظالم ہیں۔ یہ نہیں فرمایا ظالم لوگ کافر ہیں۔ ورنہ اگر ایک مسلمان اپنے اوپر یا کسی کے اوپر ظلم ڈھاتا اور یہ قاعدہ کلیہ ہوتا کہ ہر ظالم کافر ہے تو لوگ ہلاک ہو جاتے۔

ظالم جاہلی ادب کا معروف لفظ ہے۔ اور جور و زیادتی کے معنی میں اسی زمانہ میں اصطلاح کا درجہ پا چکا تھا۔ قرآن مجید نے اس اصطلاح کو عقیدہ و عمل سے جوڑ کر ایک نیا معنی پہنایا ہے۔ اس لیے اس لفظ کا دوسرا ارتقاء قرآن کے ذریعہ ہوا۔ عربی ادب جس کا بہر حال مرہون منت ہے۔

---

[1] تفسیر المنار

فصل دوم

فرائض و عبادات

العبادۃ

العبادۃ، العبودۃ، العبودیۃ، اور العبدیۃ کے بنیادی معنی عاجزی و درماندگی کا اظہار کرنا ہیں، اپنے آپ کو کسی دوسرے کے بالکلیہ حوالہ کر دینا کہ وہ جیسے چاہے کام لے اور ذرہ برابر اس کی حکم عدولی نہ کرنا۔

جاہلی معاشرہ میں اس لفظ کا بہت چلن تھا، غلامی ان کے سیاسی اور سماجی اقدار کا ایک حصہ تھی، اس تعلق سے ان کے یہاں بہت سے اصول و ضوابط بھی مقرر تھے، اس لیے کلام عرب میں اس لفظ کا بکثرت استعمال پایا جاتا ہے، اوس بن حجر کا شعر ہے:

أبنی لبینی لستُ معترفا لیکون أولادُ منکمُ أحدُ
أبنی لبینی إن أمکم أمۃ وإن أباکم عبدُ[1]

ایک دوسرے شاعر نے کہا ہے:

ھمام یعبدنی قومی وقد کثرت فیھم أبا عمرو ما شاءوا وعبدان[2]

اس معنی میں قرآن مجید میں بھی یہ لفظ آیا ہے، آیت قصاص کے الفاظ ہیں:

والحر بالحر والعبد بالعبد والأنثی بالأنثی آزاد کے بدلہ آزاد، غلام کے بدلہ غلام اور عورت کے بدلہ عورت ہی سے قصاص لیا جائیگا۔ (بقرہ ۱۷۸)

غلام کا آقا کے سامنے اظہار درماندگی اور خود سپردگی کے مفہوم سے پوجا و پرستش کا مفہوم بھی نکلا ہے، اس لیے اس میں بھی بندہ اپنے معبود کو برتر مان کر اس کے سامنے اپنی پیشانی

---

[1] دیوان اوس بن حجر ص ۲۱

[2] لسان العرب، بذیل مادہ عبد

ختم کرتا ہے اور اس کی اطاعت کا بیان کرتا ہے۔ یہ معنی بھی اہل عرب میں معروف و متداول تھا، کیونکہ ان کے یہاں بھی خدا کی کبریائی کا ایک تصور پایا جاتا تھا، اور اس کی عبادت کے بہت سے طریقے رائج تھے۔ خانہ کعبہ تو ان کے سیکڑوں خداؤں کی آماجگاہ تھا اور خوب پوجا پاٹ ہوتی تھی، نابغہ کے درج ذیل شعر میں عبادۃ بمعنی پرستش کا استعمال دیکھئے:

لو أنها عرضت لأشمط راهب ... عبد الإله، صرورة، متعبد

لرنا لبهجتها وحسن حديثها ... ولخاله رشداً وإن لم يرشد[1]

معبد کا لفظ عبادت خانے کے لئے اسی زمانے سے مستعمل ہے، حاتم طائی کا شعر ہے:

تقول أراها أمسك عليك فإنني ... أرى المال عند الباخلين معبدا[2]

قرآن مجید میں عبادت کے وہی معنی مراد لئے گئے ہیں جو جاہلی شاعری میں مستعمل تھے، لغوی مفہوم میں کوئی فرق نہیں ہے، البتہ قرآن مجید کا تصور عبادت اس سے بہت مختلف ہے جو جاہلی معاشرہ میں رائج تھا۔

قرآن مجید کا تصور عبادت یہ ہے کہ صرف ایک خدا کی پرستش کی جائے، صحیح معنوں میں اسی کی عبادت و پرستش میں کسی کو شریک نہ ٹھہرایا جائے، صرف اسی سے لو لگائی جائے اسی سے مدد مانگی جائے،

اسلام میں لفظ عبادت کو اتنی وسعت حاصل ہے کہ بندہ کے وہ تمام نیک اعمال عبادت تصور کئے جاتے ہیں جن کا مقصد خدا کے سامنے اپنی بندگی کا اظہار اور

---

[1] دیوان النابغۃ ۹۵-۹۶؛

[2] دیوان حاتم الطائی ۵۰؛

اس کی اطاعت و خوشنودی کی طلب ہو، اس وسعت کے اندر متعین ارکین اسلام کی پابندی اخلاقی اقدار کا لحاظ، معاملات کی درستگی، حقوق کی ادائیگی، دین کی اشاعت، ملت کی فلاح و بہبود کے لیے کوشش نیز اس کی پوری زندگی کے کام شامل ہیں، جو تخلیق انسانی کا بنیادی مقصد ہے۔

قرآن و حدیث میں اس کی بہت سی جزئیات بھی بیان ہوئی ہیں، مثلاً قرآن مجید میں تلاش معاش (البقرہ ۱۷۲) خدا پر اعتماد و توکل ( ) مشکلات میں صبر و استقلال ( ) شکستہ دل سے اس کی تسکین و تشفی کی بات کرنا، اور کسی گناہ گار کو معاف کر دینا سب کچھ عبادت کے دائرہ میں آتا ہے۔ (البقرہ ۲۶۳)

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات و ہدایات میں راستہ سے تکلیف دہ اشیاء کا ہٹا دینا[1] کسی بھائی سے خوش خوشی ملنا[2]، کسی غریب اور بیوہ کی مدد کرنا[3]، باہم لوگوں کے درمیان سے بغض و عناد اسباب کو دور کرنا[4]، اپنے بال بچوں پر خرچ کرنا یہاں تک کہ وقت پر سونا اور وقت پر جاگنا سب کچھ عبادت میں شامل ہے۔

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوئی کہ "عبادت" کی اصطلاح اپنے مفہوم و مدلول کے اعتبار سے دونوں فنون میں ایک ہی طرح استعمال ہوئی ہے، البتہ اسلام نے اس مفہوم میں کافی وسعت دی ہے، اور اس کو اپنے بنیادی معنی سے مزید قریب تر کیا ہے۔

---

[1] الصحیح لمسلم، کتاب البر والصلہ، باب فضل ازالۃ الاذی من الطریق!

[2] " " باب استحباب طلاقۃ الوجہ عند اللقاء!

[3] " کتاب الزھد، باب فضل الاحسان الی الارملۃ، والمسکین والیتیم!

[4] " کتاب البر والصلہ، باب تحریم الکذب وما یباح منہ!

الصلوٰۃ

الصلوٰۃ: قرآن مجید کی ایک معروف اصطلاح ہے۔ ارکانِ اسلام میں دوسرے اہم رکن کا نام "صلوٰۃ" ہے۔ جس کی ادائیگی کے طریقے، شرائط اور آداب کے سلسلے میں ماخذ میں بڑی طویل بحثیں ہوئی ہیں۔

اس لفظ کی لغوی تحقیق میں ماہرینِ لغت نے کافی پیچ و خم کھائے ہیں، یہاں تک کہ اس کے مادہ کے سلسلے میں بھی کئی رائیں پائی جاتی ہیں، کوئی اس کا مادہ ص ل و بتاتا ہے[1] تو کسی کا کہنا ہے کہ صحیح مادہ ص ل ی ہے۔[2] اس جو مختلف معانی مصادر میں بیان ہوتے ہیں ان کی تفصیل درج ذیل ہے۔

۱۔ الصَّلا (ص ل و) پشت کا درمیانی حصہ، کولہے کا ڈھلوان مادہ حصہ جس پر جانوروں کی دم لگے، دم کے دونوں جانب کے حصے۔ صَلوان کہلاتے ہیں۔ الصلا کی نسبت سے مستی الفرس تصلیۃ اس وقت کہتے ہیں جو گھوڑوں کی مسابقت میں دوسرے نمبر کا گھوڑا پہلے نمبر کے گھوڑے کے پیچھے پیچھے اس طرح دوڑ رہا ہو کہ پچھلے کی کنوتیاں پہلے کی سرین سے مل رہی ہوں۔ اس گھوڑے کو جو آگے جا رہا ہو مسابق کہتے ہیں اور دوسرے نمبر والے کو المصلی۔ لغوین میں ابن درید الازدی صاحب جمہرۃ اللغۃ اور مفسرین میں زمخشری نے صلوٰۃ کو اسی سے ماخوذ بتایا ہے۔[3] اسلامی عرب میں اس کے استعمال کی نظیر یہ شعر ہے:

ترکت الرمح یعرق فی صلاہ کان سنانہ ضرطوم نسر[4]

---

[1] جمہرۃ اللغۃ مادہ صلا؛

[2]

[3] جمہرۃ اللغۃ مادہ صلا، والکشاف ج ۳ ص ۱۳۱؛

[4] حوالہ مذکور۔

اور ثابت بن حرن النفشلی کا شعر ہے:

ان تبتدر غایۃ یوما لمکرمۃ تلق السوابق منا والمصلینا[1]

۲۔ زجاج کا کہنا ہے کہ صلوۃ کے معنی لزوم یعنی وابستگی کے ہیں، اللہ تعالیٰ نے اپنے حکم کے ذریعہ اسے ہمیشہ کے لیے اپنے بندوں کے ساتھ لگا دیا ہے، اس لیے اس رکن اسلام کا نام بھی "صلوۃ" پڑ گیا ہے۔[2]

۳۔ صلی علیہ: امام راغبؒ نے لکھا ہے کہ اس کے معنی ہیں تعظیم کرنا اور دعا دینا، "صلوۃ" بھی دعا ہی ہے اس لیے اسے نماز کے معنی میں اصطلاح کا درجہ دے دیا گیا۔[3]

۴۔ ایک رائے یہ ہے کہ "صلوۃ" صلۃ سے ماخوذ ہے، یہ عبادت بندہ کو اپنے خدا سے ملاتی ہے، اس لیے اس کا نام صلوۃ پڑ گیا۔

صلوۃ کا لفظ طلب و دعا کے لیے جاہلی ادب میں بہت مقبول رہا ہے، کلام عرب میں اس کی متعدد مثالیں موجود ہیں، اعشیٰ کا شعر ہے، اس نے شراب کی تعریف میں کہا ہے:

وصہباء طاف یہودیہا وأبرزہا وعلیہ ختم
وقابلہا الریح فی دنہا وصلی علی دنہا وارتسم[4]

اعشیٰ نے اسی معنی میں دوسری جگہ کہا ہے:

علیک مثل الذی صلیت فاغتمضی یوما فان لجنب المرء مضطجعا[5]

---

[1] جمہرۃ اللغۃ مادہ صلا؛
[2] لسان العرب بذیل مادہ؛
[3] المفردات، بذیل مادہ؛
[4] دیوان الاعشیٰ ص ۳۵؛
[5] حوالہ مذکور ص ۱۰۱؛

مذکورہ بالا معانی میں اصطلاح صلوٰۃ کا سب سے گہرا تعلق صلوٰۃ بمعنی طلب و دعا سے معلوم ہوتا ہے، کلام عرب میں اس کا استعمال عام تھا اور خود قرآن مجید میں یہ لفظ مذکورہ معنی میں کئی جگہ وارد ہوا ہے۔

ان اللہ وملائکتہ یصلون علی النبی	اللہ اور اس کے ملائکہ نبیؐ پر درود بھیجتے ہیں۔
یا ایہا الذین آمنوا صلوا علیہ وسلموا تسلیما	اے لوگو جو ایمان لائے ہو تم بھی ان پر درود
(احزاب ۵۶)	وسلام بھیجو۔
خذ من اموالہم صدقۃ تطہرہم وتزکیہم	اے نبیؐ! تم ان کے اموال میں صدقہ کے لیے انہیں
بہا وصل علیہم ان صلوتک سکن لہم	پاک کرو اور تزکیہ کی راہ میں انہیں بڑھاؤ اور
(توبہ ۱۰۳)	ان کے حق میں دعا رحمت کرو کیونکہ تمہاری دعا
	ان کے لیے وجہ تسکین ہوگی۔

یہیں سے ترقی کر کے یہ لفظ نماز کے معنی میں اصطلاح کا درجہ پا گیا۔ جو بلاشبہ دعا ہی کی ایک عظیم الشان صورت ہے۔

یہاں یہ بات خصوصاً قابل ذکر ہے کہ "صلوٰۃ" قرآن مجید کی بالکل نئی اصطلاح ہے، عبادت بالخصوص نماز کے لیے استعمال کا ابتدائی تخیل بھی جاہلی ادب میں موجود نہ تھا، قرآن مجید نے اس لفظ کو ایک مخصوص عبادت کے نام کے طور پر منتخب کیا، اور یہ اتنا استعمال ہوا کہ اس اصلیت کا پتہ لگانا مشکل ہو گیا ہے۔

الطہارۃ

الطہارۃ: مادہ طہر، مصدر طُہراً و طُہراً و طَہارۃً کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز سے نجاست کا دور ہو جانا۔[1] ابن فارس نے اس کے معنی ستھرا پن اور میل کچیل کا زائل ہو جانا بتایا ہے۔[2] یہ دراصل نجاست یعنی ناپاکی کا ضد ہے۔ طُہر و طاہر صفت کا صیغہ ہے جس کی جمع اطہار و طہاری ہے، آخر الذکر کا استعمال شاذ و نادر ہی ہوتا ہے۔

کلام عرب میں طہارۃ کے مشتقات انہی معنوں میں استعمال ہوتے ہیں، ابن منظور نے ابن الاعرابی کا یہ شعر بطور نظیر نقل کیا ہے:

أضعت المال للأحساب حتی　　خرجت مبرأ طہر الثیاب[3]

قرآن مجید میں طہارت کے ۳۱ مشتقات متعدد مقامات پر آئے ہیں، قرآن نے اس لفظ کو استعمالات عرب سے اوپر اٹھایا ہے، اور پھر اصطلاح کا درجہ دیا ہے۔ متعلقہ آیات کے تتبع سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کے نزدیک طہارت کے دو مفہوم ہیں۔ طہارت حسی اور طہارت معنوی:

طہارت حسی طہارت حسی سے مراد وہ طہارت ہے جو جسم پر یا کپڑے پر لگی ہوئی غلاظت کو دور کر کے حاصل کی جائے، یا نواقض وضو و غسل کے پیش آجانے کے بعد وضو و غسل کر کے حاصل کی جائے۔ شدید ارشاد باری ہے:

وینزل علیکم من السماء ماءً لیطہرکم　　اور آسمان سے تمہارے اوپر پانی برسا رہا تھا
(الانفال ۱۱)　　تاکہ تمہیں پاک کرے۔

وان کنتم جنبا فاطہروا (مائدہ ۶)　　اگر جنابت کی حالت میں ہو تو نہا کر پاک ہو جاؤ۔

---

[1] تاج العروس، بذیل مادہ

[2] ابن فارس، بذیل مادہ

[3] لسان العرب، بذیل مادہ طہر۔

یہی قرآن مجید کا اصطلاحی مفہوم ہے، اس کے مخصوص احکام اور طریقے بیان کرنے کے لیے فقہ کی کتابوں میں بڑے بڑے ابواب مخصوص ہیں۔

طہارت معنوی نیت کی پاکیزگی، قلب کی صفائی اور ایمان کی پختگی کے لیے بھی قرآن مجید میں طہارت کے مشتقات آئے ہیں۔ صدقہ کی تاثیر یہ بتائی گئی ہے کہ وہ تطہیر و تزکیہ کا کام کرتا ہے:

خذ من أموالهم صدقة تطهرهم وتزكيهم بها۔ (توبہ ۱۰۳)	اے نبیؐ! تم ان کے اموال میں سے صدقہ لے کر انہیں پاک کرو، اور (نیکی کی راہ میں) انہیں بڑھاؤ۔
اولئك الذين لم يرد الله ان يطهر قلوبهم (مائدہ ۴۱)	یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں کو اللہ نے پاک کرنا نہ چاہا۔

حضرت مریم علیہا السلام کے بارہ میں ارشاد ہوا ہے:

ان الله اصطفٰك وطهرك واصطفٰك على نساء العالمين (آل عمران ۴۲)	اللہ نے تجھے برگزیدہ کیا اور پاکیزگی عطا کی اور تمام دنیا کی عورتوں پر تجھ کو ترجیح دے کر اپنی خدمت کے لیے چن لیا ہے۔

اس تجزیہ سے یہ بات واضح ہوئی کہ طہارۃ کے جاہلی اور اسلامی دونوں معنوں میں کافی قربت و مناسبت ہے، مگر قرآن نے اس کے استعمالات میں وسعت پیدا کی ہے اور عبادات سے اس کا تعلق قائم کر کے بہت اہم نقطہ بنا دیا ہے۔

الوضو

لفظ وضو یا اس کا کوئی مشتق قرآن مجید میں ایک جگہ بھی وارد نہیں ہوا ہے۔ لیکن وضو ایک معروف شرعی اصطلاح ہے۔ اس کا حکم اور مفصل طریقہ قرآن مجید کی اس آیت میں بیان ہوا ہے۔

یا ایہا الذین آمنوا اذا قمتم الی الصلوٰۃ	اے لوگو جو ایمان لائے ہو، جب تم نماز کے لئے
فاغسلوا وجوھکم وأیدیکم الی المرافق و	اٹھو تو چاہئے کہ اپنے منھ اور ہاتھ کہنیوں تک دھولو
امسحوا برؤسکم وارجلکم الی الکعبین وان	سروں پر ہاتھ پھیرو اور پاؤں ٹخنوں تک دھو لیا کرو
کنتم جنباً فاطھروا وان کنتم مرضی او	اگر جنابت کی حالت میں ہو تو نہا کر پاک ہو جاؤ
علی سفر أو جاء احد منکم من الغائط	اگر بیمار ہو یا سفر کی حالت میں ہو یا تم میں سے کوئی
او لمستم النساء فلم تجدوا ماءً فتیمموا	شخص رفع حاجت کر کے آئے، یا تم نے عورتوں کو
صعیداً طیباً فامسحوا بوجوھکم وأیدیکم منہ	ہاتھ لگایا ہو اور پانی نہ ملے تو پاک مٹی سے کام لو بس
ما یرید اللہ لیجعل علیکم من حرج ولکن	اس پر ہاتھ مار کر اپنے منھ اور ہاتھوں پر پھیر لیا کرو۔ اللہ
یرید لیطھرکم ولیتم نعمتہ علیکم	تم پر زندگی کو تنگ نہیں کرنا چاہتا۔ مگر وہ چاہتا ہے
لعلکم تشکرون	کہ تمہیں پاک کرے۔ اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دے
(المائدہ ۶)	شاید کہ تم شکر گذار بنو۔

وضو کا مادہ وض ء ہے۔ مصدر وُضوءٌ اور وِضاءَۃٌ، اس کے بنیادی معنی کسی چیز کے پاکیزہ اور خوبصورت ہونے کے ہیں، نابغہ ذبیانی نے اسی معنی میں ایک جگہ اسے استعمال کیا ہے۔

تُحلینَ بکرٌ یکونُ والبطنُ کُرّہ	فَھُنَّ إضاءٌ صافیاتُ الغلائل [1]

---

[1] دیوان النابغہ ص ۱۲۷

شاعر نے اس شعر میں چہرے کی خوبصورتی کے لئے وضاءۃ کہا ہے، یعنی واو کی جگہ ہمزہ لادیا ہے جیسا کہ إساد وبساد کی جگہ پر، إشاح وشاح کی جگہ پر اور اعاد وعاد کی جگہ پر عام طور سے مستعمل ہے۔ یہ لفظ حسن وخوبصورتی کے لئے بہت مشہور ہے۔

وضو جو شرعی اصطلاح ہے چہرہ اور کہنیوں تک دونوں ہاتھ دھونے، سر کا مسح کرنے اور پیروں کو ٹخنے تک دھونے کے عمل کا نام ہے۔ اس عمل سے لازماً چہرے پر خوبصورتی وبشاشت ظاہر ہوتی ہے۔ اس لئے اس مبارک عمل کے لئے یہ لفظ مخصوص کر دیا گیا۔ یہ بالکل نئی اسلامی اصطلاح ہے اس معنی کا ابتدائی تخیل بھی جاہلی ادب میں نہیں پایا جاتا تھا۔ قرآن مجید کے ایک حکم کی وجہ سے وضو بمعنی خوبصورتی وبشاشت سے ترقی کر کے ایک مخصوص عمل عبادت کے لئے استعمال ہونے لگا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان مبارک نے وضو کی تعبیر میں چار چاند لگا دیئے ہیں: حضرت ابوہریرۃ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے سنا ہے: میری امت کے لوگوں کو جب قیامت کے دن بلایا جائے گا تو وہ اس حال میں آئیں گے کہ ان کے چہرے ہاتھ اور پاؤں وضو کے اثرات کی وجہ سے سفید براق ہو گئے (یعنی دمکتے چمکتے ہو گئے۔ چہرہ دونوں ہاتھ اور دونوں پاؤں نورانی ہو گئے) اس لئے تم میں سے جو شخص بوقت وضو اپنے چہرے کو زیادہ پھیلا کر دھوئے اور اپنے نور کو بڑھا سکے وہ ایسا ضرور کرے۔ [1]

---

[1] الصحیح للبخاری، کتاب الوضوء، باب فضل الوضوء والغر المحجلون من آثار الوضوء

التیمم

التیمم: مادہ ا م م باب تفعل سے مصدر ہے، اس کے معنی قصد و ارادہ کے ہیں، قرآن مجید میں تین مقامات پر اس کے مشتقات آئے ہیں۔ جو اسی معنی میں مستعمل ہیں۔

اَمّ، تیمم اور اس مادہ کے دوسرے مشتقات جاہلی ادب میں قصد و ارادہ معنی بکثرت آئے ہیں۔ ابوذؤیب الھذلی کا شعر ہے:

فَیَمَّمَ وَقْبَةً أَعیا جِناحاھا علی ذی النیقة اللبق الرفیق [1]

صاحب معلقہ اعشیٰ نے کم از کم دو جگہ تیمم کو قصد و ارادہ کے معنی میں استعمال کیا ہے!

تیممت قیسا و کم دونہ من الأرض من مھمة ذی شزن [2]

اور دوسرا شعر ہے:

فلما علتہ الشمس و استوقد الحصی تذکرنی الشرب للمتیمم [3]

اشعار کے علاوہ نثر میں بھی اس کے استعمال کی نظیریں موجود ہیں، مگر کبھی اپنے بنیادی معنی قصد و ارادہ سے ہٹ کر نہیں استعمال ہوا ہے۔

قرآن مجید میں تیمم کے مشتقات تین مقامات پر وارد ہوئے ہیں، سورہ بقرہ میں یہ لفظ ٹھیک اسی معنی میں آیا ہے جس میں وہ کلام عرب میں پہلے سے رائج ہے۔

ولا تیمموا الخبیث منہ تنفقون اے ایمان والو، اپنے کمائے ہوئے مال میں

---

[1] دیوان الھذلیین ج ۱ ص ۸۹؛

[2] دیوان الاعشیٰ ص ۵۵؛

[3] حوالہ مذکور ص ۱۵۷؛

طیبٰت ما کسبتم ومما اخرجنا لکم من الارض ولا تیمموا الخبیث منه تنفقون ولستم باخذیه الا ان تغمضوا فیه.

(البقرہ ۲۶۷)

سے خرچ کرو اور ان چیزوں میں سے خرچ کرو جو ہم نے تمہارے لئے زمین سے پیدا کی ہیں اور اس میں سے وہ مال تو خرچ کرنے کا خیال بھی نہ کرو، جس کو خدا کی راہ میں خرچ کرنے پر تو آمادہ ہو جاؤ لیکن اگر وہی مال تمہیں لینا پڑ جائے تو بغیر آنکھیں میچے اس کو نہ لے سکو۔

اس کے علاوہ بقیہ دو مقامات پر یہ لفظ اپنے بنیادی معنی میں ہی استعمال ہوا ہے، مگر اس کے سیاق میں نماز اور نماز سے پہلے طہارت کے وجوب سے اس "قصد" کو وضو کے متبادل عمل کے لئے مخصوص مانا گیا ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ وضاحت بھی فرما دی ہے کہ اس "قصد" سے مراد پانی نہ ہونے کی صورت میں یا پانی کے مضر ہونے کی صورت میں وضو و غسل کی جگہ چہرہ اور دونوں ہاتھوں پر پاک مٹی سے مسح کرنا ہے۔ متعلقہ آیت یہ ہے:

وان کنتم جنبا فاطهروا وان کنتم مرضٰی او علی سفر او جاء احد منکم من الغائط او لمستم النساء فلم تجدوا ماءً فتیمموا صعیدا طیبا فامسحوا بوجوهکم وایدیکم منه

(مائدہ ۶ دس و ۴۳)

اگر جنابت کی حالت میں ہو تو نہا کر پاک ہو جاؤ، اگر بیمار ہو یا سفر کی حالت میں ہو یا تم میں سے کوئی شخص رفع حاجت کر کے آئے یا تم نے عورتوں کو ہاتھ لگایا ہو، اور پانی نہ ملے تو پاک مٹی سے کام لو، بس اس پر ہاتھ مار کر اپنے چہرہ اور ہاتھوں پر پھیر لیا کرو۔

کلام عرب اور قرآن و حدیث کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوئی کہ تیمم ہر دو مقام پر ایک ہی معنی میں استعمال ہوا ہے، مگر قرآن مجید میں ایک مخصوص سیاق و سباق میں آنے کی وجہ سے اس سے

وضو کا متبادل مراد لیا ہے اور کثرتِ استعمال کی وجہ سے یہ اس مخصوص عمل کیلئے "غسل" کا درجہ پا گیا ہے۔ ابن سیدہ نے اس کی یہی توجیہہ کی ہے۔[1]

اس طرح کلام عرب اور قرآن مجید کے استعمالات میں یک نیت کے باوجود ایک نئی اصطلاح وجود میں آ گئی جس کا بنیادی محرک بہرحال قرآن مجید ہی ہے۔ اسے عربی ادب میں اضافہ پر محمول کیا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔

[1] لسان العرب۔ ذیل مادہ ا م م!

الأذان

اذان: شرعی اصطلاح میں اذان نماز کے لیے پکار کو کہتے ہیں۔ مؤذن اس شخص کو کہا جاتا ہے جو مسجد کے مینار سے مقررہ الفاظ باآواز بلند ادا کرے۔

اس لفظ کا لغوی معنی آگاہ کرنا، بتانا، کوئی بات سنانا، یا کسی کام کی اجازت دینے کے ہیں۔ جاہلی ادب میں اس کی متعدد نظیریں موجود ہیں۔ اذان بمعنی اعلام والاعلان کے معنی میں حارث بن حلزہ کا شعر ہے:

آذنتنا ببینها أسماء رب ثاو یمل منه الثواء [1]

آذنتنا اذان اور مؤذن دونوں کے لیے بولا جاتا ہے۔ لسان العرب مادہ اذن کے ضمن میں یہ جاہلی شعر منقول ہے:

لهمو الحصى كانت أذينا ولم تكن بها ريبة مما يخاف تريب [2]

اذن اجازت کے معنی میں بالکل عام ہے۔

قرآن مجید میں مادہ اذن کے تقریباً ایک سو بیس مشتقات مختلف مواقع پر وارد ہوئے ہیں۔ اور ان آیات کے تتبع سے معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا معانی کو قرآن مجید نے بعینہٖ استعمال کیا ہے، اور بظاہر اس میں کوئی تبدیلی یا ارتقاء نہیں ہوا ہے۔

اذان بمعنی اعلان کی مثال سورہ توبہ کی یہ آیت ہے:

وأذان من الله ورسوله إلى الناس اعلان عام ہے اللہ اور اس کے رسول

---

[1] شرح المعلقات السبع ۱۶۷؛

[2] لسان العرب بذیل مادہ اذن؛

یوم الحج الاکبر ان اللہ بریٔ من المشرکین ورسولہ (توبہ ۳) — کی طرف سے حج اکبر کے دن تمام لوگوں کے لیے اللہ مشرکین سے بری الذمہ ہے اللہ اور اس کا رسول بھی۔

اور پکارنے و سنانے کے معنی میں سورہ یوسف کے یہ الفاظ:

ثم أذن مؤذن ایتہا العیر انکم لسارقون۔ (یوسف ۷۰) — پھر ایک پکارنے والے نے پکار کر کہا اے قافلے والو، تم لوگ چور ہو۔

اجازت و اباحت کے معنی میں سورہ نور کی یہ آیت بطور نظیر پیش کی جا سکتی ہے:

فان لم تجدوا فیہا احداً فلا تدخلوہا حتی یؤذن لکم۔ (نور ۲۸) — پھر اگر وہاں کسی کو نہ پاؤ تو داخل نہ ہو جب تک تم کو اجازت نہ دے دی جائے۔

کلام عرب اور قرآنی استعمالات کے اس تقابل سے یہ چیز ہے کہ یہ لفظ ہر دو ادوار میں ایک ہی طریقہ سے استعمال ہوتا رہا ہے۔ البتہ اس کے نمازی پکار کے لیے مخصوص ہو جانے اور کثرت استعمال سے ایک نیا آہنگ اختیار کر لینے کے بعد لفظ کی حیثیت بالکل بدل گئی ہے۔ اور اسے یہ نیا پیراہن عہد نبوی میں ہی مل گیا تھا، جو بظاہر قرآنی استعمالات ہی سے ماخوذ معلوم ہوتا ہے۔ اس طرح اس لفظ کو تطورات لغت کے اس مرحلہ میں رکھا جانا چاہئے جس میں قرآن نے براہ راست لفظ کو اصطلاح کا درجہ نہیں دیا ہے بلکہ بعد کے ادوار میں انہیں استعمالات کی روشنی میں انہیں یہ مقام دے دیا گیا۔

الرکوع

الرکوع: رَکَعَ یَرْکَعُ رَکْعًا و رُکوعًا کے بنیادی معنی ہیں سر جھکانا، پشت خم کرنا، اسی بنیادی معنی سے ترقی کر کے مجازی طور پر خضوع و انکساری کے مفہوم میں بھی استعمال ہونے لگا، پھر ایک رکن صلوٰۃ کے علم ہو جانے کے بعد اس میں ایسی غیر معمولی تبدیلی ہوئی کہ اصل استعمالات تقریباً متروک ہو گئے۔

کلام عرب میں یہ لفظ بکثرت استعمال ہوا ہے اور بنیادی و مجازی دونوں معانی میں آیا ہے۔ بنیادی معنی کی نظیر کے طور پر ابن منظور نے لسان العرب میں کسی جاہلی شاعر کا کلام نقل کیا ہے:

وأفلتَ حاجبَ فوتَ العوالی علی فَسْقًا تَرکَعُ فی الظِّرابِ [1]

بڑھاپے کی وجہ سے کمر میں جب خم آجاتا ہے تو اس کو بھی رکوع سے تعبیر کرتے ہیں۔ لبید کے اشعار میں ہے:

أَلیسَ ورائی إن تراخت منیتی لزومُ العصا تحنی علیها الأصابعُ

أخبرَ أخبارَ القرونِ التی مضت أُدِبُّ کأنی کلما قمتُ راکعُ [2]

اسی بنیادی معنی سے مجازی معنی بھی نکالا گیا ہے، مثلاً کوئی خوشحال آدمی اگر بدحال ہو جائے تو اس کے لیے بولا جاتا ہے۔ رکع الرجل" یعنی فقر نے اس کی پیٹھ کو جھکا دیا، کسی شاعر نے کہا ہے:

ولا تَمْضِ الفقیرَ علیک أن تَرکَعَ یومًا والدهرُ قد رفعه [3]

کلام عرب کے تتبع سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ "رکوع" کا جو اصطلاحی مفہوم ہے، اس

---

[1] لسان العرب بذیل مادہ رکع

[2] دیوان لبید ص ۸۹

[3] لسان العرب بذیل مادہ رکع

کی طرف ابتدائی پیش رفت خود دورِ جاہلیت میں ہو چکی تھی۔ چنانچہ اس زمانہ میں جو "دینِ حنیف" کے پیرو تھے اور بت پرستی سے گریز کرتے تھے ان کو "راکع" بھی کہا جاتا تھا نابغہ ذبیانی کے ایک شعر میں اس کا استعمال اس طرح ہوا ہے:

سیبلغ عذرا أو نجاحا من امرئ إلی ربہ، رب البریۃ، راکع [1]

مگر یہ حقیقت اپنی جگہ مسلم ہے کہ اس اصطلاح کو نزولِ قرآن کے بعد ہی قبولِ عام حاصل ہوا، اور کبھی نماز کے ایک رکن مشدد رکوع اور کبھی ایک حصہ مشدد رکعات کے لئے بولا جانے لگا۔

قرآن مجید میں رکوع کے مشتقات ایک درجن سے زیادہ مقامات پر آئے ہیں، اور تمام آیات کا تجزیاتی مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ کم از کم تین معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ درج ذیل آیات میں معروف اصطلاحی مفہوم میں ارشاد ہوا ہے:

یا ایہا الذین آمنوا ارکعوا واسجدوا	اے لوگو جو ایمان لائے ہو، رکوع اور سجدہ
واعبدوا ربکم (حج ۷۷)	کرو، اپنے رب کی بندگی کرو۔
وعہدنا الی ابراہیم واسماعیل ان	اور ابراہیم و اسماعیل کو تاکید کی تھی کہ میرے
طہرا بیتی للطائفین والعاکفین	اس گھر کو طواف اور اعتکاف اور رکوع اور سجدہ
والرکع السجود (البقرہ ۱۲۵)	کرنے والوں کے لئے پاک رکھو۔

رکوع کا اطلاق بعض مواقع پر پوری نماز کے لئے ہوا ہے، اہلِ کتاب کو مخاطب کر کے ایک جگہ ارشاد ہوا ہے:

ولا تلبسوا الحق بالباطل وتکتموا الحق	باطل کا رنگ چڑھا کر حق کو مشتبہ نہ بناؤ

---

[1] دیوان النابغہ ص ۲۳۷؛

وانتم تعلمون واقیموا الصلوٰۃ وآتوا الزکوٰۃ وارکعوا مع الراکعین۔ (بقرہ ۴۲-۴۳)

اور نہ جانتے بوجھتے حق کو چھپانے کی کوشش کرو، نماز قائم کرو، زکوٰۃ دو اور جو لوگ میرے آگے جھک رہے ہیں ان کے ساتھ تم بھی جھک جاؤ۔

رسمِ ثریت کے مفہوم کی مزید وضاحت سورہ مرسلات کی درج ذیل آیت سے ہو جاتی ہے:

واذا قیل لھم ارکعوا لا یرکعون (المرسلات ۴۸)

جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کے آگے جھکو تو نہیں جھکتے۔

اور تمام آیات کا اگر ایک ساتھ مطالعہ کیا جائے اور ایک مجموعی مفہوم نکالا جائے تو "رکوع" کا اصل مفہوم خضوع، تواضع اور خشوع ہے، یہ معنی بنیادی، مجازی اور اصطلاحی تینوں میں مشترک ہے، اور یہی مطلوب بھی ہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام کی اطاعت و شکر گذاری کے لئے ارشاد ہوا ہے:

وظن داؤد انما فتناہ فاستغفر ربہ وخر راکعا واناب (ص ۲۴)

(یہ بات کہتے کہتے) داؤد سمجھ گئے کہ یہ تو ہم نے دراصل اس کی آزمائش کی ہے۔ چنانچہ اس نے اپنے رب سے معافی مانگی اور سجدے میں گر گیا اور رجوع کیا۔

مومنین بالخصوص صحابہ کرام کی توصیف میں ارشاد ہوا ہے

تراھم رکعا سجدا یبتغون فضلا من اللہ ورضوانا

تم جب دیکھو انہیں رکوع و سجود اور اللہ کے فضل اور اس کی خوشنودی کی طلب میں مشغول پاؤ گے۔

لفظ رکوع کے تجزیہ سے یہ بات واضح ہوئی کہ اس میں معنوی وسعت کا رجحان زمانۂ جاہلیت سے پایا جاتا تھا، قرآن مجید نے مختلف حیثیتوں سے اس کا ذکر کر کے اصطلاح کا درجہ دیا ہے، اور یہ لفظ اپنے بنیادی معنی سے ہٹ کر اصطلاحی مفہوم میں محصور ہو گیا۔

السجدة

السجدة: السجود کے معنی ہیں سر کو جھکانا، ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی پست ہونا اور جھک جانا لکھے ہیں،[1] نخلة ساجدة: جھکے ہوئے کھجور کے درخت کو کہتے ہیں، بالخصوص وہ جو پھلوں کے بوجھ سے جھک جائے، لبید کا شعر اسی معنی میں ہے:

بنی الصفا وخلیج العین ساکنة غُلْبٌ سواجد لم یدخل بها الحصر[2]

رکوع اور سجدہ بظاہر مترادف الفاظ ہیں؛ تاہم لغویین نے دونوں کے درمیان اس باریک فرق کی وضاحت کی ہے کہ رکوع میں جھکاؤ کم ہوتا ہے جبکہ سجدہ میں جھکاؤ اتنا ہوتا ہے کہ پیشانی زمین سے لگ جائے۔ بڑوں کی تعظیم، سرداروں و بادشاہوں کی اطاعت، احبار کی پیروی اور لب اوقات بہادر سواروں کے خوف سے اس کے قدموں میں گر جانے کے لئے لفظ سجدہ کا استعمال اسی بنیادی معنی سے نکلا ہے، جس کا دور جاہلیت میں خوب خوب رواج تھا۔ چنانچہ کلام عرب میں اس کی بہت سی نظیریں موجود ہیں، اعشیٰ کا شعر ہے:

فلما أتانا بعید الکری سجدنا له ورفعنا عمارا[3]

اور عمرو بن کلثوم کا یہ بیت بے حد مشہور ہے:

إذا بلغ الفطام لنا صبی تخر له الجبابر ساجدینا[4]

---

[1] تاج العروس بذیل مادہ؛

[2] دیوان لبید ص (۵۶)؛

[3] دیوان اعشیٰ ۸۷؛

[4] شرح المعلقات السبع ص ۱۲۵؛

قرآن مجید میں سجود کے اسمی ۸۰ سے زیادہ مشتقات آئے ہیں، اور موقع و محل کے اعتبار سے بنیادی، مجازی اور اصطلاحی تینوں معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ اصطلاحِ شریعت میں سجدہ ایک رکنِ صلوٰۃ کا نام ہے جس میں بندہ اپنے آپ کو بالکلیہ اپنے معبودِ حقیقی کے سامنے پیش کر کے اس کی عظمت و کبریائی کا اعتراف کرتا ہے۔ یہیں سے مجازی طور پر اطاعت و فرمانبرداری، احکام کی بجا آوری کے لئے بھی یہ لفظ استعمال ہونے لگا جو دراصل اظہارِ اطاعت اور قربِ الٰہی کا سب سے بہترین ذریعہ ہے۔ ذیل میں قرآن مجید سے تینوں طرح کے استعمالات کی نظیریں پیش کی جا رہی ہیں۔ بنیادی و حقیقی معنی کے لئے سورہ اسراء کی یہ آیت ہے:

واذا یتلی علیھم یخرون للاذقان سجداً (الاسراء ۱۰۷)	انہیں جب یہ سنایا جاتا ہے تو وہ منہ کے بل سجدے میں گر جاتے ہیں۔

اصطلاحی معنی کی مثال درج ذیل آیات ہیں:

والذین یبیتون لربھم سجداً وقیاماً (فرقان ۶۴)	جو اپنے رب کے حضور سجدے اور قیام میں راتیں گزارتے ہیں۔
ومن اللیل فاسجد لہ وسبحہ لیلا طویلا (الدھر ۲۶)	رات کو بھی اس کے حضور سجدہ ریز ہو اور رات کے طویل اوقات میں اس کی تسبیح کرتے رہو۔

اور مجازی کی مثال میں ایسی تمام آیات پیش کی جا سکتی ہیں جن میں چاند و سورج، شجر و حجر اور زمین و آسمان کے درمیان تمام مخلوقات کے خالقِ کائنات کے سامنے سجدہ ریز ہونے کا ذکر آیا ہے۔

الم تر ان اللہ یسجد لہ من فی السموات ومن فی الارض والشمس والقمر والنجوم	کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ کے آگے سجدہ میں ہیں وہ سب جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں

والجبال والشجر والدواب وکثیر من الناس (الحج ۱۸)[1]

سورج اور چاند اور تارے اور پہاڑ اور درخت اور جانور اور بہت سے انسان۔

سجود ہی کا ایک مشتق "مسجد" ہے جو بجائے خود ایک نئی قرآنی اصطلاح ہے مسجد سجدہ گاہ کو کہتے ہیں اور اصطلاحی طور پر ان مقامات کو مسجد کہا جاتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی عبادت اور نماز باجماعت کے لئے مخصوص کر دیئے گئے ہوں۔

اس تجزیہ سے یہ بات واضح ہوئی کہ سجدہ کا بنیادی اور مجازی دونوں معنی دورِ جاہلی میں موجود تھا۔ قرآن نے ایک رکن صلوٰۃ کا تعلق بنا کر اسے بہت اوپر اٹھایا ہے۔ اور سجدہ ریزی کے جو غلط طریقے رائج ہو گئے تھے۔ ان کی سختی سے نکیر کی ہے۔ اسی مفہوم کو شاعرِ مشرق علامہ اقبال نے اس طرح ادا کیا ہے۔

وہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

[1] نیز دیکھئے رعد ۱۵؛ نحل ۴۹؛ رحمٰن ۶؛ نمل ۲۵؛

الزکوٰۃ

زکوٰۃ: کے بنیادی معنی ہیں، نمو، افزونی، اضافہ۔ اسم مصدر ہوکر یہ لفظ نشوونما، بالیدگی، پھولنا پھلنا وغیرہ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ ازکی اللہ المال، اللہ تعالیٰ نے مال کو نشوونما دی، زکا الرجل آدمی آسودہ اور خوشحال ہوگیا، اس کے علاوہ لغت میں زکوٰۃ کے معنی طہارت اور برکات بھی ہیں۔

کلام عرب میں اس کا استعمال صرف لغوی معنی میں ہوا ہے، فرد واحد کے لئے "خسا" اور ایک سے زیادہ افراد کے لئے "زکی" کا لفظ بولا جاتا ہے، اسی وجہ سے کم یا زیادہ کے مفہوم میں عربی میں "خسا ام زکی" کی مثل مشہور ہوگئی۔[1] اسی طرح عرب بولتے ہیں "ھذا الامر لا یزکو بخلاف" یہ معاملہ اسے راس نہیں آئیگا۔ اسی مفہوم میں کسی شاعر نے کہا ہے:

والمال یزکو بك مستکبرا یختال قد اشرق للناظر[2]

قرآن مجید میں لفظ زکوٰۃ ۳۲ بار آیا ہے جن میں ۲۶ بار صلوٰۃ کے ساتھ آیا ہے، اس کے مشتقات بھی تقریباً ۲۸ مقامات پر آئے ہیں۔ تمام آیات کے تتبع سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ یہ لغوی اور اصطلاحی دونوں معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ لغوی اور مجازی مفہوم کی مثال درج ذیل آیات ہیں:

ولولا فضل اللہ علیکم ورحمتہ ما زکی منکم من احد ابدا (النور ۲۱)

اگر اللہ کا فضل اور اس کا رحم وکرم تم پر نہ ہوتا تو تم سے کوئی شخص پاک نہ ہو سکتا۔

---

[1] لسان العرب، بذیل مادہ

[2] حوالہ مذکور

الم تر الی الذین یزکون انفسھم. بل اللہ یزکی من یشاء ولا یظلمون فتیلا	تم نے ان لوگوں کو بھی دیکھا ہے جو بہت اپنی پاکیزگی نفس کا دم بھرتے ہیں؟ حالانکہ پاکیزگی تو اللہ ہی جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے اور (انہیں جو پاکیزگی نہیں ملتی تو درحقیقت) ان پر ذرہ برابر ظلم نہیں کیا جاتا۔

زیادہ تر مقامات پر یہ لفظ اصطلاحی مفہوم میں آیا ہے، اور اس سے مراد مخصوص شرائط کے ساتھ کسی مستحق آدمی کو اپنے مال کے ایک معین حصے کا مالک بنا دینا ہے، اور امام راغب کے الفاظ میں وہ حصہ جو مال سے حق الٰہی کے طور پر لازماً نکال کر فقرا کو دیا جاتا ہے۔ اس زکوٰۃ میں تیسرے کہا جاتا ہے اس میں برکت کی امید ہوتی ہے، اور اس سے مال و نفس دونوں پاکیزہ ہوتے ہیں[1]۔ یہ ایک رکن اسلام ہے اور اس کی تعمیل ہر مسلمان، عاقل، بالغ اور صاحب نصاب شخص پر ضروری ہے۔ اس کا منکر بھی خارج از اسلام قرار پاتا ہے:

اقیموا الصلوٰۃ وآتوا الزکوٰۃ وارکعوا مع الراکعین (البقرہ ۴۳)	نماز قائم کرو، زکوٰۃ دو اور جو لوگ میرے آگے جھک رہے ہیں ان کے ساتھ تم بھی جھک جاؤ۔
وسیجنبھا الاتقی الذی یؤتی مالہ یتزکی۔ (اللیل ۱۲-۱۸)	اور اس سے دور رکھا جائیگا وہ نہایت پرہیزگار جو پاکیزہ ہونے کی خاطر اپنا مال دیتا ہے۔

کلام عرب اور قرآنی آیات کے اس تقابلی مطالعہ سے یہ بات واضح ہوئی کہ لفظ زکوٰۃ دور جاہلیت میں صرف لغوی مفہوم تک ہی محدود تھا، کیونکہ اس زمانہ میں مال کے حق ملکیت اور اس کی تقسیم کا کوئی باقاعدہ نظام نہ تھا، قرآن نے تقسیم مال کا ایک نظام دیا اور زکوٰۃ، اس کا ختم قرار پایا اور اس مفہوم میں اتنی کثرت سے استعمال ہوا کہ بنیادی معنی لوگوں کے ذہن سے اوجھل ہو گیا۔

---

[1] المفردات بذیل مادہ

الصدق

الصدق: ص د ق مادے سے صدق کے معنی ہیں 'سچائی'، اس کا ضد 'کذب' ہے۔ دونوں لفظ عموماً قول کے متعلق استعمال ہوتے ہیں، پھر قول میں بھی صرف خبر کے لئے۔ گو کبھی کبھی دیگر اصناف کلام، نشد، استفہام، امر اور دعا کے لئے بھی آجاتے ہیں۔ اس کے مفہوم میں دل اور زبان کی ہم آہنگی اور کسی قول کا امر واقعہ کے مطابق ہونا شامل ہے۔ کبھی صدق اور کذب کا استعمال ہر اس چیز کے متعلق ہوتا ہے جو عقیدہ میں محقق اور موجود ہو، کوئی شخص جنگ میں حق شجاعت ادا کرے اور جو کچھ صحیح سمجھ میں آئے کر گذرے تو کہا جاتا ہے صدق فی القتال اسی طرح آیت قرآنی "لیسئل الصدقین عن صدقھم (احزاب ۸) کے معنی ہیں زبان سے سچ بولنے والوں سے ان کی عملی سچائی کے سلسلے میں دریافت کیا جائے۔ اسی طرح ہر وہ فعل جو ظاہر و باطن کے لحاظ سے فضیلت کے ساتھ متصف ہو، اسے بھی صدق سے تعبیر کیا جاتا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: "ان لھم قدم صدق عند ربھم (یونس ۲) کہ ان کے رب کے یہاں ان کے لئے اعلیٰ درجے کا مقام ہے۔ صدق کے مذکورہ بالا معانی دور جاہلیت میں بھی مستعمل تھے۔ صدق بمعنی عام سچائی کی مثال حضرت حسان بن ثابتؓ کا یہ شعر ہے:

صلی الاله علی ابن عمرو انه　　صدق اللقاء وصدق ذلک اوفق [1]

عملی سچائی کے معنی میں خفاف بن ندبہ نے گھوڑے کا وصف بیان کرتے ہوئے استعمال کیا ہے:

اذا ما استحمت ارضه من سمائه　　جری وھو موروعة وواعد مصدق [2]

---

[1] دیوان حسان بن ثابت ص ۳۹۲!

[2] شعر خفاف بن ندبہ السلمی، ص ۳۳!

اور کعب بن زہیر نے جنگ میں ثابت قدمی کے لئے بہت خوبصورت انداز میں استعمال کیا ہے:

وفی الحلم ادھان وفی العفو دربۃ وفی الصدق منجاۃ من الشر فاصدق [1]

قرآن مجید میں صدق کے مشتقات ڈیڑھ سو سے زائد بار آئے ہیں اور جیسا کہ اوپر کی مثالوں سے واضح ہوا متعدد معانی میں استعمال ہوئے ہیں۔

اس مادہ کا ایک لفظ "الصدقۃ" بروزن فَعْلَۃ قرآن مجید کی ایک مخصوص اصطلاح ہے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے خلوص نیت سے جو مال خرچ کیا جائے اسے صدقہ کہتے ہیں، چونکہ صدقہ کرنے والے اس سے صدق یعنی صلاح و تقویٰ اور بلند مراتب کا کام کرتے ہیں اس لئے یہ صدقہ کہلاتا ہے۔

قرآن مجید کی یہ ایک جامع اصطلاح ہے اس میں زکوٰۃ، خیرات اور انفاق فی سبیل اللہ کی تمام صورتیں شامل ہیں بلکہ ہر نیک کام جس میں قربانی و ایثار کا کوئی پہلو ہو اسے صدقہ کہا گیا ہے۔

یمحق اللہ الربوا ویربی الصدقات — اللہ تعالیٰ سود کا نشو و نما روکتا ہے اور صدقات کو نشو و نما دیتا ہے۔ (البقرہ ۲۷۶)

صدقہ کی یہ اصطلاح نزول قرآن کے بعد وجود میں آئی، جس کا نافذ قرآن مجید ہے اس طرح قرآن نے بنیادی معانی کو شامل کرتے ہوئے اس لفظ کو ایک نیا معنی پہنایا ہے جسے غیر معمولی قبول عام حاصل ہوا، اس لئے اسے جدید قرآنی اصطلاح میں شامل کرنا چاہیے۔

---

[1] لسان العرب، مادہ صدق۔

الصوم

الصوم: مادہ ص و م سے مصدر ہے، اس کے لغوی معنی ہیں، کسی چیز سے رکنا اور اسے چھوڑ دینا[1] چنانچہ روزمرہ کی بول چال میں صامت کو بھی صائم کہہ دیا جاتا ہے، کیونکہ وہ بات چیت ترک کرتا ہے، ایسے گھوڑے کو بھی صائم کہا جاتا ہے جو چارہ کھانا چھوڑ دیتا ہے، اور ابن منظور کے بقول، ہر کھانے، بولنے اور چلنے پھرنے سے باز رہنے والے کو صائم کہا جاتا ہے[2] کلام عرب میں یہ لفظ کافی مقبول و متداول رہا ہے چنانچہ اس کی متعدد نظیریں موجود ہیں:

خیل صیام و خیل غیر صائمۃ تحت العجاج و خیل تعلک اللجما[3]

اسی معنی میں ابوداود الایادی کا بھی ایک شعر ہے:

فارعی طارقٌ و ملتفطٌ بیضا وخیل تعدوا و اُخری صیام[4]

قرآن مجید میں صوم کے متعدد مشتقات آئے ہیں، یہ اسلام کے چوتھے رکن کا نام ہے، اصطلاح قرآن میں صوم کا مطلب ہے، طلوع فجر سے غروب آفتاب تک روزے کی نیت سے اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے ارادۃً کھانے، پینے، جنسی عمل اور ہر قسم کی لغویات سے پرہیز کرنا[5]

---

[1] لسان العرب بذیل مادہ صوم؛ [2] حوالہ مذکور

[3] دیوان النابغہ ص ۲۲۰؛

[4] الاصمعیات ص ۱۸۹؛

[5] المفردات للراغب بذیل مادہ

روزوں کی فرضیت قرآن مجید کے اس حکم سے ثابت ہوتی ہے:

یا ایہا الذین آمنوا کتب علیکم الصیام کما کتب علی الذین من قبلکم لعلکم تتقون (البقرہ ۱۸۳)	اے لوگو جو ایمان لائے ہو، تم پر روزے فرض کر دیے گئے جس طرح تم سے پہلے انبیاء کے پیروؤں پر فرض کیے گئے تھے۔ توقع ہے کہ تم میں تقویٰ کی صفت پیدا ہوگی۔

اس آیت میں روزے کی فرضیت اور اس کے بنیادی احکام بیان ہوتے ہیں، بعض دوسرے مقامات پر گناہوں کے کفارہ کے لیے روزہ رکھنے کا حکم آیا ہے (دیکھئے المجادلہ ۳-۴)

اس مطالعہ سے یہ بات واضح ہوتی کہ صوم عربی زبان کا معروف و متداول لفظ ہے، دور جاہلیت میں کثرت بولا جاتا رہا ہے۔ نزول قرآن کے بعد یہ ایک اہم رکن اسلام کا نام قرار پایا، اور ایک مخصوص معنی میں استعمال ہونے لگا، یہ تصور دور جاہلیت میں نہیں تھا۔

الحج

الحج: ارادہ کرنا، قصد کرنا، "حججت فلانا" میں نے اس کا قصد کیا۔ تاج العروس میں ہے کہ اس کے معنی کسی باعظمت ہستی کا قصد کرنا یا بکثرت قصد کرنا ہیں [1] پھر اسی سے آگے بڑھ کر اس کے مشتقات میں محجوج بمعنی مقصود، المحجہ بمعنی مکان مقصود، محجالہ بمعنی مطلوبہ شان اور الحجۃ بمعنی سال کلام عرب میں استعمال ہونے لگے۔ المخبل السعدی کا یہ شعر ابن منظور نے بنیادی معنی کی دلیل کے طور پر نقل کیا ہے:

وأشهد من عوف حلولاً كثيرة ۔۔۔ يحجون سبّ الزبرقان المزعفرا [2]

الحجۃ: سال کے معنی میں زہیر کا یہ شعر بہت مشہور ہے۔

وقفت بها من بعد عشرين حجة ۔۔۔ فلأياً عرفت الدار بعد توهم [3]

اور اسی معنی میں سلامہ بن جندل کا شعر ہے:

تجلّتم علينا حجتين عليكم ۔۔۔ وما تئأ الرحمن يعقد وتطلق [4]

خانہ کعبہ سے اہل عرب کا دیرینہ تعلق تھا۔ حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کے بعد وہی اس کے وارث و امین تھے، ان کے تمام اہم امور اسی مقام پر انجام پاتے۔ چنانچہ اس کی زیارت کے لئے ان کے یہاں چار مہینے مخصوص تھے، جو اشہر حرم کہلاتے تھے۔ ہر شخص سال میں کم از کم ایک بار ضرور زیارت کر لیتا، ان کی رسومات، پیشے، بازار اور جنگیں سب اسی مقام کے گرد

---

[1] تاج العروس بذیل مادہ

[2] لسان العرب بذیل مادہ

[3] دیوان زہیر ص ۵۷

[4] المفضلیات ۲۰۷

گھومتی تھیں، اس کو بے ضرر اور کامیاب تر بنانے کے لیے انہوں نے "نسئ" کا نیا طریقہ ایجاد کیا تھا، جس کے مطابق حج کا موسم ان کی مرضی کے مطابق آتا تھا۔

کلام عرب میں خانہ کعبہ کی عظمت اور اس کی زیارت پر بہت مواد موجود ہے، زہیر کا شعر ہے:

فاقسمت بالبیت الذی طاف حولہ　　رجال بنوہ من قریش وجرہم [1]

حج ان کے نزدیک ایک مذہبی فریضہ تھا، ان کا خیال تھا کہ اس کے ذریعہ گناہوں کی معافی ہو جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ کا قرب نصیب ہوتا ہے، اسی مفہوم پر یہ شعر دلالت کرتا ہے:

ترکت احتجاج البیت حتی تظاھرت　　علیّ ذنوب لیس لی عنھن ذنوب [2]

حج ایک معروف قرآنی اصطلاح ہے، اور اسلام کے پانچویں اور آخری رکن کا نام بھی، اصطلاح قرآن میں "شریعت اسلامی کے مکلف افراد کو مقررہ ایام میں مکہ جاکر خانہ کعبہ، عرفات مزدلفہ اور منیٰ میں مقررہ اعمال و آداب بجالانے کا نام ہے"[3]۔ حج کی فرضیت درج ذیل آیت سے ثابت ہوتی ہے:

وللہ علی الناس حج البیت من	لوگوں پر اللہ کا یہ حق ہے کہ جو اس گھر تک
استطاع الیہ سبیلا (آل عمران ۹۷)	پہونچنے کی استطاعت رکھتا ہے وہ اس کا حج کرے۔
الحج اشھر معلومات فمن فرض	حج کے مہینے سب کو معلوم ہیں جو شخص ان مقررہ مہینوں
فیھن الحج فلا رفث ولا فسوق ولا جدال	میں حج کی نیت کرے، اسے خبردار رہنا چاہیے کہ حج کے دوران

---

[1] شرح المعلقات السبع

[2] لسان العرب بذیل مادہ؛

[3]

فی الحج — اس سے کوئی شہوانی فعل، کوئی بدعملی، کوئی لڑائی جھگڑے کی بات سرزد نہ ہو۔ (البقرہ ۱۹۷)

واذن فی الناس بالحج یاتوک رجالا وعلی کل ضامر یاتین من کل فج عمیق — اور لوگوں کو حج کے لیے اذنِ عام دو کہ وہ تمہارے پاس ہر دور دراز مقام سے پیدل اور اونٹوں پر سوار آئیں۔ (الحج ۲۷)

خلاصہ یہ کہ یہ لفظ دورِ جاہلیت سے معاصر زمانہ تک ایک ہی مفہوم میں استعمال ہوتا رہا ہے، البتہ اس کی ادائیگی کے طریقے میں قرآن مجید نے کئی اصلاحات کی ہیں، اور اس کے بہت سے شرائط و حدود مقرر کیے ہیں۔ اب حج بول کر صرف وہی مفہوم مراد لیا جاتا ہے، جو قرآن مجید نے متعین کیا ہے، اس کلمے کے بنیادی معنی کو باقی رکھ کر قرآن مجید نے اس کی دلالت کو خاص کر دیا ہے، اور اس لفظ کو ایک نئی تعبیر عطا کی ہے۔

العمرة

العمرة: اعتمار سے ماخوذ ہے، اس کے معنی زیارت کے ہیں۔ اعتمر الرجل فلاناً آدمی نے فلاں شخص سے ملاقات کی، اسی مفہوم میں اعشیٰ باہلہ کا شعر ہے:

وجاشت النفس لما جاء جمعهم ۔۔۔ ورأکب جاء من تثلیث معتمر [1]

عمرہ عرب میں ہمیشہ زیارت بالخصوص خانہ کعبہ کی زیارت کے لیے بولا گیا ہے۔ اس مفہوم کے متعدد اشعار دواوین عرب میں موجود ہیں۔ بنی زبید کے کسی شاعر نے کہا ہے:

یا اهل فهر لمظلوم بضاعته ۔۔۔ ببطن مکة نائي الدار والنفر

وحُرِّم شَيْبٌ لم يقض عُمْرَتَه ۔۔۔ یا للرجال وبین الحِجْرِ والحَجَرِ [2]

متمم بن نویرہ کا ایک شعر اسی مفہوم پر دلالت کرتا ہے:

یطوفون عماراً اذا ما تغوروا ۔۔۔ ولاقوا قریشاً خبروها فأنجدوا [3]

عمرہ کی اہل عرب کے نزدیک بڑی اہمیت تھی۔ ان کی تہذیبی قدروں میں اس کا شمار ہوتا تھا۔ پورے عرب میں اس کا کثرت سے رواج تھا۔ ابرھۃ الاشرم کو یہی بات ناگوار لگتی تھی کہ آخر اس گھر میں رکھا کیا ہے کہ پورا عرب اسی کی طرف کھنچا جاتا ہے۔ قرآن مجید نے عرب کے اس شعار کو باقی رکھا اور اہل اسلام کو اس کی ادائیگی کی تلقین کی۔

قرآن مجید میں عمرہ کے الفاظ دو مقامات پر اور اعتمر صرف ایک مقام پر آیا ہے

---

[1] الاصمعیات ص ۸۸؛

[2] کتاب الاوائل ص ۹۶؛

[3] الاصمعیات ص ۹۲؛

لغوی اعتبار سے قرآن مجید کا مفہوم بھی وہی ہے جو کلام عرب میں پہلے سے رائج تھا، تاہم قرآن مجید نے اس کے آداب و شرائط مقرر کر کے اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے طریقۂ ادائیگی کی اصلاح کر کے لفظ کی دلالت کو کسی قدر بدل دیا ہے۔ دور جاہلیت میں عمرہ میں بتوں کی پوجا ہوتی تھی، طواف ننگے بدن کیا جاتا تھا، گھروں میں سیدھے دروازے سے نہیں داخل ہوتے تھے، اسلام نے ان باتوں کی ممانعت کر دی ہے اور عمرہ احرام کی حالت میں خانہ کعبہ کے طواف، صفا و مروہ کے درمیان سعی اور اس کے بعد حلق یا تقصیر کا نام قرار پایا، اس کے مکمل احکام و آداب فقہ کی کتابوں میں تفصیل سے درج ہیں۔

عمرہ کا تذکرہ قرآن مجید میں ان الفاظ میں آیا ہے:

واتموا الحج والعمرۃ للہ	اللہ کی خوشنودی کے لیے جب حج اور عمرہ کی نیت
(البقرہ ۱۹۶)	کرو تو اسے پورا کرو۔
ان الصفا والمروۃ من شعائر اللہ	یقیناً صفا اور مروہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں، لہٰذا
فمن حج البیت او اعتمر فلا جناح	جو شخص بیت اللہ کا حج یا عمرہ کرے اس کے لیے کوئی گناہ
علیہ ان یطوف بہما	کی بات نہیں کہ وہ ان دونوں پہاڑیوں کے درمیان
(البقرہ ۱۵۸)	سعی کرے۔

ان تفصیلات سے یہ بات واضح ہوئی کہ عمرہ کی اصطلاح دور جاہلیت سے رائج تھی قرآن نے اس کے آداب و حدود کو متعین کر کے اور اسے اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لیے خاص کر کے لفظ کی دلالت کو کسی قدر بدل دیا ہے۔

المناسك

نسك الثوب: اس نے کپڑے کو دھو کر پاک اور صاف کر لیا۔ صاحب محیط المحیط نے لکھا ہے کہ اس مادہ کے اصل معنی دھونے اور صاف کرنے کے ہیں۔ باقی تمام معانی اسی اصول پر متفرع ہیں[1]

ارضٌ ناسکة سرسبز و شاداب زمین جس پر نئی نئی بارش ہوئی ہو۔

اسی بنیادی معنی کی رو سے اس سے مراد کسی معاملہ کو درست اور ٹھیک کر لینا ہوتا ہے۔ نسك السبيكة کے معنی ہیں اس نے سونے کی زمین کو درست کیا۔ نَسَكَ إلى طريقة جميلة اس نے اچھا طریقہ اختیار کیا، اور پھر اسی پر مداومت کی۔[2]

راستہ اختیار کر لینے کی جہت سے کلام عرب میں مَنْسَكٌ ہر اس مقام کو کہتے ہیں جس پر چلنے کے لوگ عادی ہو گئے ہوں، اسی سے حج کے ارکان و مراسم کو منسک جمع مناسك کہا جانے لگا، کیونکہ اس کا ایک مخصوص طریقہ متعین ہو گیا تھا۔ نُسُكٌ یا نسیکةٌ ذبیحہ کو یا خون کو کہا جاتا ہے۔ النُّسُك بمعنی ذبیحہ زہیر بن سلمیٰ کے شعر میں آیا ہے:

فنزل عنها وآوى رأس مرقبة كمنصب العير رَثَّ رأسه النُّسُكُ[3]

اعشیٰ نے بھی اسی مفہوم میں اس لفظ کو استعمال کیا ہے:

وذا النصب المنصوب لا تنسكنه ولا تعبد الشيطان والله فاعبدا[4]

---

[1] محیط المحیط، بذیل مادہ،

[2] تاج العروس بذیل مادہ

[3] دیوان زہیر ص ۵۰،

[4] دیوان اعشیٰ ص ۱۷۳،

قرآن مجید میں اس کے مشتقات ناسکوہ، نسک، نسکی، منسکا اور مناسک وغیرہ سات مقامات پر آئے ہیں اور کم از کم تین معانی میں استعمال ہوتے ہیں۔

آیت ذیل میں یہ لفظ قربانی کے مفہوم میں ہے:

...فمن کان منکم مریضاً أو بہ أذیً	مگر جو شخص مریض ہو، یا جس کے سر میں
من رأسہ، ففدیۃ من صیام أو	کوئی تکلیف ہو، اور اس بنا پر اپنا سر منڈوالے۔
صدقۃ أو نسک	تو اسے چاہئے کہ فدیہ کے طور پر روزے
(البقرہ ۱۹۶)	رکھے یا صدقہ دے، یا قربانی کرے۔

سورۃ انعام کی آیت ۱۶۲ میں یہ عام عبادات کے لئے آیا ہے:

قل ان صلاتی ونسکی ومحیای و	کہو، میری نماز، میرے تمام مراسم عبودیت، میرا
مماتی للہ رب العالمین (انعام ۱۶۲)	جینا اور میرا مرنا سب کچھ اللہ رب العالمین کے لئے ہے۔

اس کا ایک شیرا مفہوم حج کے امور و مراسم ہیں۔ اسلام کے آنے تک اس لفظ کا استعمال ابتدائی معنی سے ترقی کر کے قربانی یا عبادت کے مفہوم تک پہونچ سکا۔ مگر حج کے مخصوص ارکان و مراسم کے لئے اس کا استعمال پہلی بار قرآن نے کیا ہے:

فاذا قضیتم مناسککم فاذکروا اللہ	پھر جب اپنے حج کے ارکان ادا کر چکو، تو جس طرح
کذکرکم آباءکم أو أشد ذکراً	پہلے اپنے آباء و اجداد کا ذکر کرتے تھے، اسی طرح
(البقرہ ۲۰۰)	اب اللہ کا ذکر کرو، بلکہ اس سے بھی بڑھ کر۔

اس کے بعد یہ لفظ حج کے معمولات کے لئے مخصوص ہو گیا، اس طرح قرآن مجید نے عربی زبان میں ایک نئی اصطلاح کا اضافہ کیا۔

الطواف

"طوف" کے معنی گھومنے اور چکر لگانے کے ہیں، کسی چیز کے ارد گرد بکثرت چلنا، الطاف: گھومنے کی جگہ کو کہتے ہیں۔ الطائفہ کسی چیز کا ٹکڑا، لوگوں کی جماعت جو ہم آہنگی فکر و خیال یا اشتراک مذہب کی بنا پر متحد ہو، اور اس سبب سے دوسروں سے ممتاز ہو، قدیم ادب میں یہ لفظ انہی معنوں میں مستعمل تھا۔ اس کے بنیادی معنی چکر لگانے بالخصوص گھر کا چکر لگانے کے معنی میں استعمال کی نظیر کلام عرب میں موجود ہے، الاخرم کا شعر ابن منظور نے نقل کیا ہے:

تطیف علیہ الطیر وھو ملحب　　خلاف البیوت عند محتمل الصرم [1]

قرآن مجید میں طوف کے ۱۲ مشتقات ۳۹ مرتبہ آئے ہیں، سیاق و سباق کے لحاظ سے مفسرین نے ہر جگہ ان کا مفہوم متعین کیا ہے، تاہم ہر جگہ اس کی اصل روح باقی ہے۔

الطواف: حج کا ایک لازمی رکن اور قرآن مجید کی مخصوص اصطلاح ہے، تین مقامات پر اس کے مشتقات اسی مفہوم میں آئے ہیں۔

وعھدنا الی ابراھیم واسماعیل ان	اور ابراہیم اور اسماعیل کو تاکید کی تھی کہ میرے
طھرا بیتی للطائفین والعاکفین و	اس گھر کو طواف اور اعتکاف اور رکوع اور
الرکع السجود (البقرہ ۱۲۵)	سجدہ کرنے والوں کے لئے پاک رکھو۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:

فمن حج البیت او اعتمر فلا جناح	لہٰذا جو شخص بیت اللہ کا حج یا عمرہ کرے، اس
علیہ ان یطوف بھما ومن تطوع خیرا	کے لئے کوئی گناہ کی بات نہیں کہ وہ ان دونوں

---

[1] لسان العرب بذیل مادہ طوف؛

فان اللہ شاکر علیم

(البقرہ ۱۵۸)

پہاڑیوں کے درمیان سعی کرے، اور جو برضا و رغبت کوئی بھلائی کا کام کرے، اللہ کو اس کا علم ہے اور وہ اس کی قدر کرنے والا ہے۔

ثم لیقضوا تفثھم ولیوفوا نذورھم و لیطوفوا بالبیت العتیق

(الحج ۲۹)

پھر اپنا میل کچیل دور کریں اور اپنی نذریں پوری کریں اور اس قدیم گھر کا طواف کریں۔

مذکورہ بالا آیات میں خانہ کعبہ کے ارد گرد یا صفا و مروہ کے درمیان چکر لگانے کے لئے طواف کے مشتقات آئے ہیں، جو بظاہر اپنے حقیقی لغوی مفہوم میں ہیں، مگر انہیں مشتقات سے "الطواف" جب رکن حج بن گیا تو یہ لفظ ایک مخصوص اصطلاحی مفہوم پر دلالت کرنے لگا، اب بغیر کسی واضح قرینہ کے طواف کا اس کے علاوہ کوئی مفہوم مراد نہیں لیا جا سکتا، جو شریعت اسلامی نے متعین کیا ہے۔

شریعت کی اصطلاح میں طواف سے مراد مخصوص طریقے سے خانہ کعبہ کے گرد سات چکر لگانا اور پھر دعا مانگنا ہے۔ شریعت کی نگاہ میں یہ نماز روزے کی طرح ایک مخصوص بالذات عبادت ہے، اس لئے طواف کرتے وقت ضروری ہے کہ انسان کا بدن اور لباس پاک و صاف ہو

الکعبۃ

الکعب: ہڈیوں کا جوڑ، ابھری ہوئی ہڈی جو پیر کے اوپر پائنڈلی اور پیر کے جوڑ پر ہوتی ہے، بالخصوص پیر کا ٹخنہ۔ قرآن مجید میں "وأرجلکم إلی الکعبین" (مائدہ ۶) دونوں ٹخنوں کے لئے آیا ہے، کعب اور کعبۃ مربع ہڈی جس پر زنانات لگے ہوئے ہوں، عام طور پر ان سے جوا کھیلا جاتا ہے، انہیں پانسہ بھی کہتے ہیں۔ کعبۃ اونچی اور مربع جگہ کو بھی کہتے ہیں، نیز الکعب شرف اور بزرگی کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔

الکعبۃ: بیت اللہ الحرام کے لئے مخصوص ہے۔ اس کی تعمیری ہیئت کی بنا پر کعبہ اس کا نام پڑا کیونکہ وہ بالکل چوکور ہے، نیز اس میں عظمت و تقدس کا عنصر بھی شامل ہے، عرب حبشہ سے الکعبۃ کہتے آئے ہیں، بلکہ ان کے دوسرے جو مشہور بت خانے تھے، انہیں بھی کعبہ ہی کے نام سے یاد کرتے تھے، مثلاً کعبۃ الاقیصر، الکعبۃ الیمانیۃ، کعبۃ صنعاء اور کعبۃ نجران وغیرہ، تاریخ عرب اور کلام عرب دونوں میں ان کا تذکرہ ملتا ہے۔ کعبۃ الاقیصر کے بارہ میں زہیر بن سلمی کا شعر ہے:

حلفت بالصاب الأقیصر جاهدا ... وما سحقت فیه المقادم والقمل [1]

اور کعبہ نجران کے بارہ میں اعشیٰ نے اپنی اونٹنی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ہے:

فکعبۃ نجران حتم علیك ... حتی تناخی بأبوابها

نزور یزید وعبد المسیح ... وقیسا هم خیر أربابها [2]

جہاں تک کعبۃ مکہ یعنی بیت اللہ کا تعلق ہے، اس کی اہمیت حبشہ مسلم رہی ہے، ان کی مذہبی

---

[1] دیوان زہیر ص ۵۸؛

[2] دیوان اعشیٰ ص ۲۰۹؛

سیاسی، سماجی اور تجارتی تمام سرگرمیوں کا مرکز رہا ہے۔ اسی کے نام پر لوگ اکٹھا ہوتے تھے، اور اسی کے گرد و پیش تمام امور سرانجام پاتے تھے، کلام عرب میں اس کا تذکرہ بھرا پڑا ہے، نابغہ نے ایک جگہ کہا ہے:

فلا لعمر الذی مسحت کعبته — وما أُرِیق علی الانصاب من جسد

ما إن مدحت لشیء أنت تکرهه — إذن فلا رفعت سوطی إلی یدی[1]

قرآن مجید میں دو جگہ یہ لفظ آیا ہے اور ہر جگہ اس سے خانہ کعبہ مراد ہے، ارشاد باری ہے:

جعل اللہ الکعبة البیت الحرام قیاما — اللہ نے مکان محترم، کعبہ کو لوگوں کے لئے (اجتماعی

للناس (المائدہ ۹۷) — زندگی کے لئے) قیام کا ذریعہ بنایا۔

یحکم به ذوا عدل منکم هدیا بالغ — جس کا فیصلہ تم میں سے دو عادل آدمی کریں گے،

الکعبة (المائدہ ۹۵) — اور یہ نذرانہ کعبہ پہونچایا جائیگا۔

دنیا کے تمام مقامات میں اسلام کے نزدیک سب سے زیادہ اسی کی اہمیت ہے، یہ جلیل القدر انبیاء کی نشانی، توحید الٰہی کا بنیادی مرکز اور پوری دنیائے اسلام کا قبلہ ہے۔ قرآن مجید کی یہ اصطلاح/نام دور جاہلیت سے ماخوذ ہے، اس کا ٹھیک یہی مفہوم اس زمانے میں بھی رائج تھا، اس لئے یہ کہنا مناسب ہوگا کہ دونوں ادوار میں اس لفظ کے مفہوم میں ادنیٰ تغیر بھی واقع نہیں ہوا۔

---

[1] دیوان النابغہ ص ۲۵

الجہاد فی سبیل اللہ

جہاد اور مجاہدہ فِعال اور مفاعلت کے وزن پر جہد سے مصدر ہے، اس کے بنیادی معنی محنت و کاوش کرنا ہیں۔ اعشیٰ کا شعر ہے:

فجالت وجال لہا اربع　　جُھِدْنا لہا مع اجھادھا [1]

باب مفاعلہ سے جَاھَدَ دشمنوں کے خلاف پورا زور و قوت صرف کرنے کے معنی جاہلی دور میں بھی مستعمل تھا، عمرو بن الاھتم نے اپنے بیٹے کو جنگ میں پامردی سے مقابلہ پر آمادہ کرتے ہوئے کہا ہے۔

وان جُھِدوا علیک فلا تھجھم　　وجاھِدھم اذا حُمِیَ القتیر [2]

شماخ نے بھی اسی معنی میں کہا ہے:

وان جاھدتہ بالخبار انبری لہا　　بذاو وان یضبط بہ السھل یمعج [3]

جہاد قرآن مجید کی ایک معروف و مقبول اصطلاح ہے، یہ اسلام کا ایک اہم فریضہ بلکہ ایک رکن اسلام ہے، قرآن مجید میں جابجا یہ لفظ آیا ہے، اور اس کے اصطلاحی مفہوم میں بھی بڑی وسعت ہے، جہاد کے مفہوم میں بطور عبادت کی جانے والی ہر وہ کوشش اور محنت شامل ہے، جو ملت کے استحکام کے لئے کی جائے، اس میں عام مجاہدہ سے ملت کے معین مصالح مثلاً حق کی سربلندی، اعلاء کلمۃ اللہ، مظلوموں کی حمایت، حملہ آوروں

---

[1] دیوان اعشیٰ ص ۱۰۹؛

[2] المفضلیات ص ۲۱۰؛

[3] دیوان الشماخ ص ۹۵؛

کا مقابلہ اور اس سے بھی آگے بڑھ کر ان کی کمین گاہوں، رسدگاہوں، چھاؤنیوں، سلسلہ رسل و رسائل اور ان کی مرکزی قوت کو ختم کرنے تک سب امور شامل ہیں۔ اس سے ظاہر ہوا کہ جہاد محض قتال (جنگ) کا نام نہیں ہے بلکہ یہ اس کی مختلف صورتوں میں سے محض ایک صورت ہے، قرآن و حدیث میں جہاد کا جو وسیع تصور پیش کیا گیا ہے، ان کے مطالعہ سے جہاد کی درج ذیل قسمیں واضح طور پر سامنے آتی ہیں۔

۱۔ جہاد بالنفس: یعنی اپنی نفس کی خواہشات سے جہاد کرنا ہیں، نفس بسا اوقات معمولی لاپرواہی سے بڑے جرائم کا ارتکاب کر بیٹھتا ہے، اس لئے اس کو جہاد اکبر کہا گیا ہے۔ خطیب نے تاریخ میں حضرت جابرؓ سے روایت کی ہے کہ آپ نے ان صحابہ سے جو ابھی ابھی میدان جنگ سے واپس آئے تھے، فرمایا تمہارا آنا مبارک ہو، تم چھوٹے جہاد (غزوہ) سے بڑے جہاد کی طرف آئے ہو، بڑا جہاد بندہ کا اپنے نفس سے لڑنا ہے۔ [1]

۲۔ جہاد بالعلم: دنیا کا تمام شر و فساد جہالت کا نتیجہ ہے، اسی کا قلع قمع کرنے کے لئے حضرات انبیاء کرام مبعوث ہوئے اور کتابیں نازل ہوئیں، انبیاء نے ہمیشہ قوم کو علمی طریقے سے حق و صداقت کی دعوت پیش کی، اسی کا حکم خود آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اور امت محمدیہ کو بھی ملا۔

اُدعُ إلیٰ سبیل ربك بالحكمة و الموعظة و جادلهم بالتي هي أحسن (نحل ۱۲۵)	تم لوگوں کو اپنے پروردگار کے راستہ کی طرف آنے کی دعوت حکمت و دانائی کی باتوں سے دو اور اچھی طرح سمجھاؤ اور اگر مناظرہ کرنا ہو تو وہ اچھے اسلوب سے کرو۔

---

[1] [illegible]

اس طریقہ دعوت کو سب سے کامیاب طریقہ بتایا گیا ہے، اور قرآن مجید نے اس جہاد کو جہاد بالقرآن کا نام دیا ہے۔

فلا تطع الکافرین وجاھدھم بہ جہادا کبیرا — تو کافروں کا کہنا نہ مان اور قرآن کو لے کر ان کے ساتھ زبردست جہاد کرو۔

۳۔ جہاد بالمال: حق کی حمایت اور نصرت میں اپنا مال و دولت خرچ کرنا بھی جہاد ہے۔ قرآن مجید نے جہاد فی سبیل اللہ کے ضمن میں جہاد بالمال کا ذکر کیا ہے، اور اس کی تاکید و فضیلت بیان ہوئی ہے۔

ان الذین آمنوا و ھاجروا و جٰھدوا باموالھم وانفسھم فی سبیل اللہ الآیۃ (الانفال ۷۲) — جن لوگوں نے ایمان قبول کیا اور ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں اپنی جانیں لڑائیں اور اپنے مال کھپائے۔

الذین آمنوا و ھاجروا و جٰھدوا فی سبیل اللہ باموالھم وانفسھم اعظم درجۃ عند اللہ (التوبہ ۲۰) — اللہ کے ہاں تو انہی لوگوں کا درجہ بڑا ہے جو ایمان لائے اور جنہوں نے اس کی راہ میں گھر بار چھوڑے اور جان و مال سے جہاد کیا۔

۴۔ جسم و جان سے جہاد کرنا: جہاد کی آخری اور انتہائی صورت ہے، اس کیلئے قرآن مجید نے ایک علیحدہ اصطلاح "قتال" بھی استعمال کی ہے، یہ جہاد کی آخری اور انتہائی صورت ہے، مخصوص حالات میں اور مخصوص اصول و ضوابط کے ساتھ اس انتہائی صورت پر عمل درآمد ہوتا ہے۔ اور اس میں شریک ہونے والا ہر فرد "مجاہد" کامیاب لوٹنے والا "غازی"، اور اللہ کی راہ میں کام آجانے والا "شہید" کہلاتا ہے، جس کی

قرآن وحدیث میں بڑی فضیلتیں آئی ہیں۔

کلام عرب اور قرآن مجید دونوں ماخذ میں یہ لفظ بکثرت استعمال ہوا ہے، جاہلی ادب میں اس کا معنی کسی قدر محدود تھا، اس وقت یہ لفظ صرف کوشش، جدوجہد اور محنت کے معنوں میں مستعمل تھا، جنگوں میں بھی اسی پس منظر میں اس کے مشتقات آتے تھے، جبکہ قرآن مجید نے اسے دو طرح سے ترقی دی ہے (۱) اس کے معنی میں غیر معمولی وسعت پیدا کی ہے۔ اور اللہ کی راہ میں کی جانے والی ہر جدوجہد کا نام جہاد رکھا ہے۔ (۲) اسے ایک بامقصد اور مفید عمل بتایا ہے اور اس کی انجام دہی میں اجر و ثواب کا وعدہ کیا ہے۔ اسی طرح قرآن نے جہاد کے دائرہ کار کو متعین کیا ہے اور اس کے مفہوم کی تنقیح کی ہے۔

فصل سوم :

رشد و هدایت

الدین

الدین: قرآن مجید کی ایک مخصوص اصطلاح ہے، یہ لفظ کلام عرب میں بہت پہلے سے مستعمل ہے، اور موقع و محل کے اعتبار سے اس کے معانی مراد لیے گئے ہیں۔

۱۔ غلبہ و اقتدار، حکمرانی و فرمانروائی، دوسرے کو اطاعت پر مجبور کرنا، اس پر اپنی قوت قاہرہ (Sovereignty) استعمال کرنا، اس کو اپنا غلام اور تابع اور بنانا وغیرہ، شعرائے عرب کہتے ہیں: وان الناس اری قہرہم علی الطاعۃ (یعنی لوگوں کو اطاعت پر مجبور کیا) دنت القوم ای اذللتہم واستعبدتہم (میں نے اس قوم کو مسخر کر لیا اور غلام بنا لیا) دنتہ ای سلستہ وملکتہ (میں اس پر حکم چلایا اور فرمانروائی کی) عام استعمال کے علاوہ جاہلی شاعری میں بھی اس کی نظیریں موجود ہیں، شاعر مزرق العبدی کا یہ شعر جو اس نے کسی بادشاہ کی مدح میں کہا ہے، غلبہ و اقتدار کے معنی پر بہت واضح دلالت کرتا ہے:

وانت عمود الدین مہما تقل یقل ۔۔۔ ومہما تضع من باطل لا یلحق [1]

اور عمرو بن کلثوم کا یہ شعر بھی اسی معنی میں آیا ہے:

وزنا بجد علقمۃ بن سیف ۔۔۔ اباح لنا حصون المجد دینا [2]

۲۔ دوسرا معنی ہے اطاعت، بندگی، خدمت، کسی کے لیے مسخر ہونا، چنانچہ کہتے ہیں: دنتہم فدانوا ای قہرتہم فاطاعوا (میں نے ان کو مغلوب کر لیا اور وہ لوگ مطیع ہو گئے) دنت الرجل ای خدمتہ (میں نے فلاں شخص کی خدمت کی، زہیر بن ابی سلمیٰ اور عمیر بن شییم القطامی کے اشعار میں بھی یہ لفظ طاعت و خدمت کے معنی میں استعمال ہوا ہے: زہیر بن ابی سلمیٰ:

---

[1] الاصمعیات ۱۶۶

[2] شرح المعلقات السبع ۱۳۸

لئن حللت بجو فی بنی اسد　　فی دین عمرو وحالت بیننا فدک[1]

اور عمیر بن شییم القطامی:

رمت المقاتل من فؤادک بعدما　　کانت لوا رتدنیک الأدیانا[2]

۳۔ شریعت، قانون اور رسم و عادات وغیرہ تسد کہا جاتا ہے: مازال ذلک دینی و دیدنی (یہ ہمیشہ میرا طریقہ رہا ہے) ویقال دان اذا اعتاد خیراً وشراً (آدمی خواہ برے طریقے کا پابند ہو یا بھلے طریقے کا دونوں مہورتوں میں اس طریقے کا وہ پابند ہے، دین کہیں گے۔ امرو القیس کا شعر ہے:

کدینک من ام الحویرث قبلها　　وجارتها ام الرباب بماسل[3]

اور شقیق العبدی کہتا ہے:

تقول اذا دارت لها وضینی　　أهذا دینه أبداً ودینی[4]

۴۔ چوتھا معنی ہے جزا، عمل، بدلہ، مکافات، قصاص اور محاسبہ وغیرہ، چنانچہ مشہور محاورہ ہے کما تدین تدان (جیسا کرو گے ویسا بھرو گے) حضرت عبداللہ بن عمر کی حدیث میں وارد ہوا ہے

لا تسبوا السلطان فان کان لابد　　اپنے حکمرانوں کو برا نہ کہو اور اگر کہنا ناگزیر ہو تو یوں کہو

فقولوا اللهم کما یدینون[5]　　خدایا جیسا کہ یہ ہمارے ساتھ کر رہے ہیں ویسا ہی کر

---

[1] دیوان زہیر ص ۵۱

[2] کتاب الزینۃ ۲/۱۲۲

[3] دیوان امرئ القیس

[4] جمہرۃ اللغۃ، ذیل مادہ دان

[5]

اسی معنی میں لفظ دیان بمعنی قاضی وحاکم عدالت آتا ہے، چنانچہ کسی بزرگ سے جب حضرت علی رضؓ کے متعلق دریافت کیا گیا تو انہوں نے کہا "کان دیان ھذہ الامۃ بعد نبیھا" یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد وہ اس امت کے سب سے بڑے قاضی تھے۔ نیز ذوالاصبع العدوانی کا یہ شعر بھی محاسبہ وجزا کے معنی کے معنی پر دلالت کرتا ہے:

لا ابن عمک لا أفضلت فی حسب غنی ولا انت دیانی فتخزونی[1]

ان تفصیلات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ لفظ دین کی بنیاد میں چار تصورات ہیں، یا بالفاظ دیگر یہ لفظ عربی ذہن کے چار بنیادی تصورات کی ترجمانی کرتا ہے۔

۱۔ غلبہ وتسلط کسی ذی اقتدار کی طرف سے

۲۔ اطاعت، تعبد اور بندگی صاحب اقتدار کے آگے جھک جانے والے کی طرف سے۔

۳۔ قاعدہ وضابطہ اور طریقہ جس کی پابندی کی جائے۔

۴۔ محاسبہ، فیصلہ اور جزا وسزا۔

انہی تصورات میں سے کبھی ایک کے لئے اور کبھی دوسرے کے لئے اہل عرب مختلف طور پر اس لفظ کو استعمال کرتے تھے مگر چونکہ ان چاروں امور کے متعلق عرب کے تصورات پوری طرح واضح نہ تھے، اور کچھ بہت زیادہ بلند بھی نہ تھے، اس لئے اس لفظ کے استعمال میں ابہام پایا جاتا تھا اور یہ کسی باقاعدہ نظام فکر کا اصطلاحی لفظ نہ بن سکا، قرآن آیا تو اس نے اس لفظ کو اپنے منشا کے لئے مناسب پایا بالکل واضح ومتعین مفہومات کے لئے استعمال کیا اور اپنی مخصوص اصطلاح بنا لیا، قرآنی زبان میں لفظ دین ایک پورے نظام کی نمائندگی کرتا ہے جس

---

[1] کتاب الزینہ ج ۲ ص ۱۲۵!

کی ترکیب چار اجزاء سے ہوتی ہے۔

(۱) حاکمیت و اقتدار اعلیٰ۔ (۲) حاکمیت کے مقابلے میں تسلیم و اطاعت (۳) وہ نظام فکر و عمل جو اس حاکمیت کے زیر اثر ہے۔ (۴) مکافات جو اقتدار اعلیٰ کی طرف سے اس نظام کی وفاداری و اطاعت یا سرکشی و بغاوت کے صلے میں دی جاتی ہے۔

قرآن کبھی لفظ دین کا اطلاق معنی اول و دوم پر کرتا ہے۔ کبھی معنی سوم پر۔ کبھی معنی چہارم پر اور کبھی "الدین" بول کر یہ پورا نظام اپنے چاروں اجزاء سمیت مراد لیتا ہے۔ اس کی وضاحت کے لئے حسب ذیل آیات قرآنی سے بخوبی ہو جاتی ہے۔

دین بمعنی اول و دوم:

اللہ الذی جعل لکم الارض قرارا والسماء	وہ اللہ جس نے زمین کو جائے قرار بنایا اور
بناء وصورکم فاحسن صورکم ورزقکم من	اس پر آسمان کا قبہ چھایا جس نے تمہاری صورتیں
الطیبات ذلکم اللہ ربکم فتبارک اللہ	بنائیں اور خوب ہی صورتیں بنائیں جس نے پاکیزہ
رب العالمین، ھو الحی لا الہ الا ھو فادعوہ	چیزوں سے تم کو رزق بہم پہونچایا، وہی اللہ تمہارا
مخلصین لہ الدین الحمد للہ رب العالمین۔	رب ہے، اور بڑی برکتوں والا ہے، وہ رب العالمین

(المومن ۶۴ ۶۵) ہے، وہی زندہ ہے، اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں، لہٰذا تم اس کو پکارو، دین کو اسی کے لئے خاص کر کے، تعریف اللہ رب العالمین ہی کے لئے ہے۔

انا انزلنا الیک الکتاب بالحق فاعبد	ہم نے تمہاری طرف کتاب برحق نازل کر دی، لہٰذا تم
اللہ مخلصاً لہ الدین الا للہ الدین	دین کو اللہ کے لئے خاص کر کے صرف اسی کی بندگی کرو
الخالص (زمر ۲-۳)	خبردار دین خالصتہً اللہ ہی کے لئے ہے۔

مذکورہ بالا دونوں آیات میں دین کا لفظ اقتدار اعلیٰ اور اس اقتدار کو تسلیم کرنے اس کی اطاعت و بندگی قبول کرنے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

دین بمعنی سوم:

ان الحکم الا للہ امر ان لا تعبدوا الا ایاہ، ذلک الدین القیم (یوسف ۴۰)

حکم ان اللہ کے سوا کسی کے لیے نہیں ہے، اس کا فرمان ہے کہ تم اس کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو، یہی صحیح دین ہے۔

لکم دینکم ولی دین (الکافرون ۶)

تمہارے لیے تمہارا دین ہے اور میرے لیے میرا دین ہے۔

ان آیات میں دین سے مراد قانون، ضابطہ، شریعت اور وہ نظام فکر و عمل مراد ہے جس کی پابندی میں انسان زندگی بسر کرتا ہے۔

دین بمعنی چہارم:

انما توعدون لصادق وان الدین لواقع (ذاریات ۶)

جس کی تم کو وعید سنائی جا رہی ہے وہ سچ ہے اور جزا و سزا بیشک واقع ہو کر رہیگی۔

وما ادراک ما الیوم الدین ثم ما ادراک ما الیوم الدین، یوم لا تملک نفس لنفس شیئا والامر یومئذ للہ (انفطار ۱۷-۲۰)

تمہیں کیا خبر کہ یوم الدین کیا ہے؟ ہاں تم کیا جانو کہ کیا چیز ہے یوم الدین، وہ وہ دن ہے جب کہ کسی متنفس کے اختیار میں کچھ نہ ہو کہ دوسرے کے کام آسکے، اس روز سب اختیار اللہ کے ہاتھ میں ہوگا۔

ان آیات میں دین بمعنی محاسبہ و فیصلہ و جزائے اعمال استعمال ہوا ہے۔

دین ایک جامع اصطلاح: یہاں تک تو قرآن نے اس لفظ کو قریب قریب انہی مفہومات

میں استعمال کیا ہے، جن میں یہ اہل عرب کی بول چال میں مستعمل تھا، لیکن دوسرے متعدد مواقع پر قرآن نے دین کو ایک جامع اصطلاح کی حیثیت سے استعمال کیا ہے۔ اور اس سے مراد ایک ایسا نظام زندگی مراد لیا ہے جس میں انسان کسی کا اقتدار اعلیٰ تسلیم کرے اور اس کی اطاعت و فرمانبرداری قبول کرے۔ اس کے حدود و ضوابط اور قوانین کے تحت زندگی بسر کرے غالباً دنیا کی کسی زبان میں کوئی ایسی جامع اصطلاح نہیں ہے جو اس پورے مفہوم پر حاوی ہو۔ حسب ذیل آیات میں 'دین' اسی اصطلاحی مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔

قاتلوا الذین لا یؤمنون باللہ ولا بالیوم الآخر ولا یحرمون ما حرم اللہ ورسولہ ولا یدینون دین الحق من الذین اوتوا الکتاب حتی یعطوا الجزیۃ عن ید وھم صاغرون (توبہ ۲۹)

اہل کتاب میں سے جو لوگ نہ اللہ کو مانتے ہیں نہ یوم آخرت کو مانتے ہیں، نہ ان چیزوں کو حرام مانتے ہیں جنھیں اللہ کے رسول نے حرام قرار دیا ہے، اور دین حق کو اپنا دین نہ بناتے ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ وہ ہاتھ سے جزیہ ادا کریں چھوٹے بن کر رہیں۔

اس آیت میں 'دین حق' اصطلاحی لفظ ہے، جس کے مفہوم کی تشریح واضع اصطلاح (جل شانہ) نے پہلے تین فقروں میں خود کر دی ہے، پھر ان کے مجموعے کو 'دین حق' سے تعبیر کیا ہے۔

ان الدین عند اللہ الاسلام (آل عمران)

اللہ کے نزدیک دین تو دراصل اسلام ہے۔

ومن یبتغ غیر الاسلام دینا فلن یقبل منہ (آل عمران)

جو اسلام کے سوا کوئی اور دین تلاش کریگا، اس سے وہ دین ہرگز قبول نہ کیا جائیگا۔

ھو الذی ارسل رسولہ بالھدیٰ ودین الحق لیظھرہ علی الدین کلہ ولو

وہ اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسول کو صحیح رہنمائی اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے، تاکہ وہ اس کی پوری

کرہ المشرکون — جنس دین پر غالب کر دے، اگرچہ
(التوبہ) — مشرک کرنے والوں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو۔

مذکورہ آیات میں دین سے پورا نظام زندگی اپنے تمام اعتقادی، نظری، اخلاقی اور عملی پہلوؤں سمیت مراد ہے۔ ان روشنی میں دین کا جامع و وسیع مفہوم آسانی سمجھا جا سکتا ہے۔[1]

[1] یہ مضمون مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے نتائج تحقیق پر مبنی ہے۔ قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں ص ۱۰۰-۱۱۱

الشریعۃ

شریعۃ: اسم المصدر ہے، جس کے لفظی معنی گھاٹ، پنگھٹ، دہلیز، عادت اور بیان و وضاحت وغیرہ کے ہیں۔ دین، ملت، منہاج، نمونہ اور مذہب وغیرہ کے لیے بھی لفظ شریعت بولا جاتا ہے۔ یہ ایک مشہور قرآنی اصطلاح بھی ہے، جو ایسے طریقۂ زندگی کے مفہوم پر دلالت کرتی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لیے مقرر کیا ہے۔[1]

عام بول چال کے علاوہ قرآن مجید میں بھی یہ لفظ مصدر اور مشتق ہر دو شکل میں استعمال ہوا ہے۔ اپنے لغوی مفہوم میں سورہ اعراف کی ایک آیت میں لفظ شُرَّعًا آیا ہے جو ظاہر اور نمایاں کے معنی میں ہے۔

واسئلھم عن القریۃ التی کانت حاضرۃ البحر اذ یعدون فی السبت اذ تاتیھم حیتانھم یوم سبتھم شرعا و یوم لا یسبتون، لا تاتیھم کذلک نبلوھم بما کانوا یفسقون	اور ذرا ان اس بستی کا حال پوچھو جو سمندر کے کنارے واقع تھی، انہیں یاد دلاؤ وہ واقعہ کہ وہاں کے لوگ سبت کے دن احکام الٰہی کی خلاف ورزی کرتے تھے، کہ یہ مچھلیاں سبت ہی کے دن ابھر ابھر کر سطح پر ان کے سامنے آتی تھیں،

لفظ شریعت پورے قرآن مجید میں صرف ایک بار آیا ہے، اور سیاق و سباق کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مذکورہ اصطلاحی مفہوم ہی مراد ہے۔

ثم جعلناک علی شریعۃ من الامر فاتبعھا ولا تتبع اھواء الذین لا یعلمون (جاثیہ ۱۸)	اس کے بعد اے نبی! تم کو دین کے معاملہ میں ایک واضح شریعت پر قائم کیا ہے، لہٰذا تم اسی پر چلو اور ان لوگوں کی خواہشات کا اتباع نہ کرو جو علم نہیں رکھتے۔

---

[1] لسان العرب، بذیل مادہ

ماسبق کی آیات میں بنی اسرائیل کا ذکر ہے کہ انہیں دین و حکمت، رزق و دولت ہر چیز سے نوازا گیا، مگر انہوں نے کسی چیز کی قدر نہ کی بلکہ سرکشی کی راہ اختیار کی، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے ارشاد ہوا کہ اس کے بعد اسی دین کے تعلق سے ایک واضح راستہ تمہارے لئے مقرر کر دیا گیا ہے ٹھیک ٹھیک اسی کی پیروی کرو۔

سورہ شوریٰ کی دو آیات میں اسی مصدر کا مشتق مکمل دین یا دین کے بنیادی اصول کے معنی میں استعمال ہوا ہے

شرع لکم من الدین ما وصّی بہ نوحاً والذی اوحینا الیک (الشوریٰ ۱۳)

اس نے تمہارے لئے وہی دین مقرر کیا جس کی ہدایت اس نے نوحؑ کو فرمائی اور جس کی وحی ہم نے تمہاری طرف کی۔

اسی سورہ کی آیت ۲۱ میں بھی صیغہ "شرعوا" بھی اسی معنی میں آیا ہے۔

أم لہم شرکاء شرعوا لہم من الدین ما لم یأذن بہ اللہ (الشوریٰ ۲۱)

کیا ان کے کچھ شریک خدا ہیں، جنہوں نے ان کے لئے وہ دین ٹھہرایا ہے جس کی اجازت اللہ نے نہیں دی ہے

مذکورہ آیات میں اس مصدر کے مشتقات بظاہر دین کے وسیع مفہوم میں استعمال ہوتے ہیں جبکہ سورہ جاثیہ کی آیت لفظ "شریعۃ" کا ایک الگ مفہوم بیان کرتی ہے، سورہ مائدہ میں اسی مصدر سے ایک دوسرا مصدر "شِرْعَۃً" آیا ہے جو شریعت کے مذکورہ مفہوم کی مزید وضاحت کرتا ہے،

لکلٍّ جعلنا منکم شرعۃ ومنہاجاً ولو شاء اللہ لجعلکم امۃ واحدۃ (مائدہ ۴۸)

ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لئے ایک شریعت اور راہ عمل مقرر کی، اگرچہ تمہارا خدا چاہتا تو تم سب کو ایک امت بھی بنا سکتا تھا۔

آیت مبارکہ کے الفاظ سے صاف ظاہر ہے کہ ہر قوم کے لئے الگ شریعت اور منہاج مقرر کیا گیا ہے اور اس کے پیچھے اقوام عالم کا مخصوص مفاد پنہاں ہے، ورنہ اللہ تعالیٰ کے لئے یہ کچھ مشکل نہ تھا کہ وہ قوموں کے بعد قومیں پیدا کرنے کے بجائے تمام اقوام کو ایک ہی ملت بنا دیتا اور

ایک ہی شریعت کا سب کو پابند کر دیا، مگر مختلف مصالح کی بنا پر ایسا نہیں کیا۔

یہیں سے دین و شریعت کے دو الگ الگ مفہوم بھی واضح ہوتے ہیں۔ دین اسلام کے ان بنیادی اصول و رہنما خطوط کا نام ہے جو روز ازل سے اقوام عالم کی فلاح و بہبود کے لئے مقرر کیئے گئے اور جس میں کسی زمانہ میں کوئی تبدیلی نہیں کی گئی، اور شریعت سے مراد وہ احکام ہیں جو ہر نبی کو اس کی قوم کے حالات اور ضروریات کے پیش نظر دیئے گئے، چنانچہ یہ بات طے شدہ ہے کہ دین کے بنیادی احکام میں کسی زمانے میں کوئی تغیر واقع نہیں ہوا مگر شریعتیں ہر نبی کے زمانہ میں مختلف رہی ہیں۔ مثلاً نماز تمام شریعتوں میں فرض رہی ہیں۔ مگر قبلہ ساری شریعتوں کا ایک نہ تھا اور اس کے اوقات، رکعات اور اجزاء میں بھی فرق تھا، اسی طرح روزہ بھی ہر شریعت میں فرض تھا۔ مگر رمضان کے تیس روزے دوسری شریعتوں میں نہ تھے، احکام طہارت کے سلسلے میں بھی روایتوں میں آتا ہے کہ شریعت موسوی میں بہت سختی تھی۔[1]

ماہرین لغت جن میں ابن منظور، جوہری، اور راغب اصفہانی خاص طور سے قابل ذکر ہیں نے اسی طرح تشریح کی ہے، کلام عرب میں بھی اپنے بنیادی لغوی مفہوم میں استعمال کی بکثرت مثالیں موجود ہیں۔ مثلاً امرؤ القیس کہتا ہے:

لما رأیت أن الشریعة همها ... وان البیاض من فرائصها دامی

تیممت العین التی عند ضارج ... یفیئ علیها الظل عرمضها طامی[2]

ان تفصیلات سے یہ بات واضح ہوئی کہ لفظ شریعہ قدیم عربی لفظ ہے، دور جاہلیت میں اس کا رواج رہا ہے، قرآن مجید نے بھی اس لغوی معانی کو بہت اونچا اٹھایا اور نئی اصطلاحات میں شامل کیا ہے، اور اب زیادہ تر اصطلاحی معنی میں ہی بولا جاتا ہے۔

---

[1] اردو دائرہ معارف اسلامیہ

[2] دیوان امرؤ القیس ۴۷۶؛

المعروف والمنکر

المعروف: مادہ ع ر ف مصدر عرفۃ و عرفاناً و معرفۃ سے مفعول کا صیغہ ہے، یہ مادہ بیک وقت متعدد معانی کا حامل ہے۔

۱۔ عرفان بمعنی علم۔ یہی بنیادی معنی ہے جس سے دوسرے تمام معانی نکلے ہیں۔ ابو ذؤیب نے ہوا کی تعریف کرتے ہوئے کہا ہے:

عرفتہ النعامی فلم یعترف خلاف النعامی من الشام ریحا[1]

عریف اور عارف علیم اور عالم کے معنی میں بولے جاتے ہیں۔ صاحب لسان نے اس کی نظیر میں طریف بن مالک عنبری کا شعر نقل کیا ہے۔

أو کلما وردت عکاظ قبیلۃ بعثوا الی عریفہم یتوسم[2]

۲۔ اعتراف: سوال کرنے کے معنی میں آتا ہے۔ اعترف فلان القوم: فلاں نے قوم کے بارہ میں پوچھا تاکہ وہ واقف ہو سکے۔ بشر بن عازم نے کہا ہے:

أسائلۃ عمیرۃ عن ابیہا خلال الجیش تعترف الرکابا[3]

۳۔ عُرف: ف کلمہ پر ضمہ اور کسرہ کے ساتھ "صبر" کے معنی میں آتا ہے، عارف صابر کو کہتے ہیں۔ طفیزہ کے درج ذیل اشعار میں فصبرت عارفۃ کی یہی تشریح کی گئی ہے:

وعلمت أن منیتی أن تأتنی لا ینجنی منہا الفرار الأسرع

---

[1] لسان العرب بذیل مادہ عرف؛

[2] حوالہ مذکور

[3] حوالہ مذکور

فصبرت عارفة لذلك حرة ترسو اذا نفس الجبان تطلع [1]

ہو۔ عرف بذبنہ عرفاً و اعترف کے معنی ہیں اقرار کرنا، قبول کرنا، یہ معنی بہت مشہور ہے۔
جہاں تک لفظ "معروف" کا تعلق ہے، یہ کلام عرب کا کثیر الاستعمال لفظ ہے
اور متعدد معانی میں استعمال ہوا ہے:

(الف) معروف "منکر" کا ضد ہے منکر کے معنی مجہول کے ہیں، اس طرح معروف
کے معنی معلوم کے ہو نگے، اسی مفہوم میں امرؤ القیس الاکبر نے کہا ہے:

وَ وَرِيَّةٍ، غبراء، قد طال عهدها مقالك فيها الورد والمرو ناعس

قطعت إلى معروفها منكراتها بعيهمة تنسل والليل دامس [2]

(ب) عرف و معروف جود و سخاوت کے معنی میں بھی آتا ہے، طرفہ کا شعر ہے:

وأبذل معروفي وأصفح خليقتي إذا كدرت أخلاق كل منيّ محض [3]

(ج) پسندیدہ اور قابل ستائش کاموں کیلئے یہ لفظ استعمال ہوتا رہا ہے، نابغہ کا شعر ہے:

فأصلي فداء لامرئ إن أتيته تقبل معروفي وتسدّ المفاقرا [4]

منکر

منکر: مادہ ن ک ر، مصدر انکار سے مفعول کا صیغہ ہے، اس کا بنیادی معنی انکار و

---

[1] دیوان عنترہ ص ۹۲؛

[2] الشعر والشعراء ج ۱ ص ۱۳۹؛

[3] دیوان طرفہ ص ۲۰۰؛

[4] دیوان النابغہ ص ۶۹؛

لاعلمی ہے، کلام عرب میں اسی اصل کی بنیاد پر متعدد معانی میں یہ لفظ بار بار آیا ہے۔

(الف) منکر: معروف کا ضد یعنی مجہول، جس کا علم نہ ہو، کہا جاتا ہے، أنکرت الشیئ و نکرتہ یعنی میں فلاں چیز کو نہیں جانتا، اعشیٰ کا شعر ہے:

وأنکرتنی وما کان الذی نکرت　　من الحوادث الا الشیب والصلعا[1]

(ب) اصطلاحی معنی میں معروف کا ضد، یعنی ناپسندیدہ اور قابل نکیر کام، اسود بن یعفر کے شعر سے ابن منظور نے اس معنی پر استدلال کیا ہے:

ألوف فلم أرض ما أبتنوا　　وکانوا ألوفی لشئ نکر[2]

(ج) النکر و النُّکر، بہت زیادہ چالاکی، عقل کی فریب کاری، رجل نکر، بہت چالاک اور طرار آدمی، المناکرۃ ایک دوسرے کو فریب دینا، اس معنی میں ابن منظور نے الاقیبل الیمنی کے شعر سے استدلال کیا ہے:

مستقبلا صحفا تدمی طرابعہا　　وفی الصحائف حیات مناکیر[3]

معروف و منکر صحیح معنوں میں　　قرآن مجید کی بہت ہی اہم اصطلاحات ہیں، اور ان کا زیادہ تر استعمال اصطلاحی مفہوم ہی میں ہوا ہے۔ عام طور سے اس اصطلاح کا مفہوم یہ سمجھا گیا ہے کہ معروف سے مراد وہ اخلاقی خوبیاں ہیں جن کا اچھا ہونا ہر ایک کے

---

[1] دیوان الاعشیٰ ص ۱۳۷؛

[2] لسان العرب بذیل مادہ نکر؛

[3] حوالہ مذکور؛

نزدیک تسلیم شدہ ہے، اسی طرح منکر ان اخلاقی خرابیوں کو کہتے ہیں جن کو عقل عام بُرا مانتی ہو، مگر عصر حاضر کے ایک مشہور عالم اور محقق مولانا سید جلال الدین عمری نے اس موضوع پر ایک معرکۃ الآراء کتاب لکھی ہے اور انتہائی مدلل انداز میں یہ ثابت کیا ہے کہ قرآن مجید میں معروف کا لفظ محض اعلیٰ اخلاقی اقدار کے لیے نہیں بولا جاتا بلکہ اعلیٰ اخلاق اس کا صرف ایک حصہ ہیں، اسی طرح منکر میں بگڑے ہوئے اخلاق ضرور شامل ہیں، لیکن اس کے معنی محض بد اخلاقی کے نہیں ہیں، خدا کی ذات وصفات، رسول کی رسالت، سنت وشریعت اور پورا اسلامی قانون معروف ہے، اور خدا اور اس کے رسول کا انکار دین وشریعت کی مخالفت کا دوسرا نام منکر ہے[1] قرآن نے "امر بالمعروف ونہی عن المنکر" کا حکم امت مسلمہ کو اسی مفہوم میں دیا ہے، اس طرح اس کے مفہوم میں بڑی وسعت پیدا ہوگئی ہے:

کنتم خیر امۃ اخرجت للناس	اب دنیا میں وہ بہترین گروہ تم ہو جسے انسانوں
تأمرون بالمعروف وتنھون عن	کی ہدایت واصلاح کے لیے میدان میں لایا گیا
المنکر وتؤمنون باللہ۔	ہے، تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بدی سے روکتے ہو
(آل عمران ۱۱۰)	اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

اسی سورہ میں چند آیات پہلے ارشاد ہوا ہے:

ولتکن منکم امۃ یدعون الی الخیر	تم میں کچھ لوگ ایسے ضرور ہونے چاہئیں جو نیکی کی طرف
ویأمرون بالمعروف وینھون عن	بلائیں، بھلائی کا حکم دیں، اور برائیوں سے روکتے
المنکر واولئک ھم المفلحون (آل عمران ۱۰۴)	رہیں، جو لوگ یہ کام کریں گے وہی فلاح پائیں گے

---

[1] معروف ومنکر ص ۹۸ وابعد

امر بالمعروف و نہی عن المنکر بعثت انبیاء کا بنیادی مقصد ہے، تمام انبیاء نے اسی فریضہ کی ادائیگی میں اپنی زندگیاں کھپائی ہیں، نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی نہیں آنے والا ہے، اس لیئے یہ فریضہ آپؐ کی امت پر عائد ہوتا ہے، اس سلسلے میں موفقہ عمری کی یہ وضاحت بھی قابل توجہ ہے کہ معروف و منکر کی تحدید و تعیین بھی شریعت کرے گی، کسی چیز کے معروف یا منکر ہونے کا فیصلہ کرنا ان کا کام نہیں، بلکہ خدا کا کام ہے۔

اس طرح یہ بات واضح ہوئی کہ معروف و منکر دور جاہلی میں اگرچہ زیادہ معانی میں مستعمل تھے، لیکن قرآن مجید نے اس کا تعلق ایمان و عقیدہ اور دعوت الی الخیر سے قائم کر کے اس کے مفہوم میں غیر معمولی وسعت پیدا کی ہے، نیز اسے خیر و شر کا معیار بنایا ہے، اس طرح قرآن مجید نے ان الفاظ کو اونچا اٹھایا ہے، اور اس کے معانی میں ایک نئی روح پھونکی ہے۔

التقویٰ

تقویٰ: مادہ وق ی، مصدر وقیاً و وِقایۃ کے بنیادی معنی کسی چیز کی حفاظت کرنا، نگہبانی و نگہداشت کرنا، چھپانا، اسے ضرر اور تکلیف دہ چیز سے بچانا۔ کلام عرب میں یہ مادہ انہی معنوں میں مستعمل تھا۔ حفاظت و نگہبانی کے معنی ابو معقل الھذلی کا شعر ہے:

فعاد علیک أن لکنتَ حظا ووافیۃ کواقیۃ الکلاب [1]

تکلیف سے بچانے کے مفہوم میں مہلہل نے استعمال کیا ہے:

ضربت صدرھا إلیّ وقالت یا عُدیّا لقد وقتک الأواقی [2]

اوس بن حجر نے بھی برائی سے بچنے کے لیے اس مادے کو اپنی شاعری میں بہت مناسب طریقہ سے جگہ دی ہے:

تقالُ بکعب واحد وتلذہ یداک اذا ما ھز بالکف یَعسِلُ [3]

اس کے علاوہ عمرو بن کلثوم، عنترہ اور اعشیٰ وغیرہ کے کلام میں بھی یہ مادہ بکثرت استعمال ہوا ہے، لیکن لفظ تقویٰ کہیں ایک بار بھی نہیں آیا ہے:

قرآن مجید میں اس مادے کے تقریباً ۳۰ مشتقات آئے ہیں اور لغوی و اصطلاحی دونوں معنوں پر دلالت کرتے ہیں، ایک جگہ نافرمانوں کو مخاطب کر کے ارشاد ہوا ہے:

---

[1] لسان العرب بذیل مادہ وقی؛

[2] حوالہ مذکور؛

[3] دیوان اوس بن حجر ص ۹۶؛

مالک من اللہ من واق	اللہ کے مقابلہ میں نہ کوئی تمہارا حامی و مددگار ہے
(رعد ۳۷)	اور نہ کوئی اس کی پکڑ سے تم کو بچا سکتا ہے۔
فاتقوا النار التی وقودھا الناس	تو ڈرو اس آگ سے جس کا ایندھن بنیں گے
والحجارۃ (بقرہ ۲۴)	انسان اور پتھر۔

قرآنی اصطلاح میں تقویٰ دل کی اس کیفیت کا نام ہے جس کی بنا پر ہر کام میں خدا کے حکم کے مطابق عمل کرنے کی شدید رغبت اور اس کی مخالفت سے شدید نفرت پیدا ہوتی ہے۔ تقویٰ کی یہ حقیقت کہ وہ دل کی کیفیت کا نام ہے، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد مبارک سے ظاہر ہے کہ ایک مرتبہ آپ نے صحابہ کرامؓ کے سامنے تقویٰ کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے دل کی طرف اشارہ کر کے کہا "التقویٰ ھھنا، التقویٰ ھھنا" یعنی تقویٰ یہاں ہے، تقویٰ یہاں ہے۔

تقویٰ کا لفظ جس طرح دلی کیفیت پر بولا جاتا ہے، اسی طرح کیفیت کے اثر اور نتیجہ پر بھی کبھی کبھی اس کا اطلاق ہوتا ہے، صحابہ کرامؓ نے کفار کے اشتعال دلانے ان سے بدلہ لینے کی پوری قوت رکھنے کے باوجود حدیبیہ کی صلح کو تسلیم کر لیا تو اللہ تعالیٰ نے اس مستحسن روش کو تقویٰ قرار دیا۔ (الفتح ۲۶)

اسلام میں تقویٰ کو بنیادی اہمیت حاصل ہے، اگر اسلامی تعلیمات کا خلاصہ صرف ایک لفظ میں بیان کرنا ہو تو اسے لفظ "تقویٰ" سے ادا کیا جا سکتا ہے۔ تقویٰ مذہب کی جان عبادت کی روح (حج ۳۲) صوم و صلوٰۃ کی غایت (بقرہ ۲۱، ۱۸۳) نزول قرآن کا مقصد (بقرہ ۲

قربانی اور دیگر شعائر الٰہیہ کے وجوب اور قانونِ قصاص کا محرک ہے (حج ۳۲)

اوپر کی تفصیلات سے یہ بات واضح ہوئی کہ اس مادے کے مشتقات کلامِ عرب اور قرآن مجید دونوں میں استعمال ہوئے ہیں، دونوں کے نزدیک بنیادی لغوی مفہوم ایک ہی ہے، لیکن دونوں زبانوں کے اصطلاحی مفہوم میں نمایاں فرق ہے، دورِ جاہلی میں یہ دنیوی برائیاں جو ان کے معاشرتی قانون میں بری سمجھی جاتی تھیں کے لیے استعمال ہوتی تھی، جبکہ قرآن نے اس کا تعلق آخرت سے جوڑا ہے، یہاں تقویٰ کی روح خوفِ خدا ہے، اور اس کا مقصد عذابِ الٰہی سے نجات حاصل کرنا ہے۔

الذکر

الذکر: الذکر والتذکار کے معنی ہیں کسی چیز کو محفوظ کر لینا، کسی بات کا دل میں حاضر کر لینا، یہ لفظ "نسیان" کا ضد ہے جس کے معنی ہیں کسی چیز کو بھلا دینا، لہٰذا ذکر کے معنی ہوئے یاد کرنا ذکر حقہ کا مطلب ہے اس کے حق کی حفاظت کی اور اس کو ضائع نہیں کیا، کسی شاعر نے کہا ہے:

تنحی علی الشوک جرازاً مقضبا والھم یذریہ اذ کاراً عجیباً [1]

اور عنترہ نے کہا ہے:

لا تذکری فرسی وما اطعمتہ فیکون جلدک مثل جلد الاجرب [2]

قرآن مجید میں تقریباً تین سو مقامات پر ذکر اور اس کے مشتقات آئے ہیں، اور سیاق وسباق کے لحاظ سے متعدد معانی میں استعمال ہوا ہے۔

۱۔ ذکر نفس قرآن مجید کو کہا گیا ہے۔

انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحافظون (حجر ۹) (نیز نحل ۴۴) رہا یہ ذکر، تو اس کو ہم نے نازل کیا ہے اور ہم خود اس کے نگہبان ہیں۔

۲۔ ذکر قرآن مجید کی صفت کے طور پر آیا ہے

ص، والقرآن ذی الذکر ص، قسم ہے نصیحت بھرے قرآن کی۔

۳۔ تمام آسمانی کتابیں جو حضرات انبیاء کرام پر نازل ہوئیں۔

ام اتخذوا من دونہ آلھۃ، قل کیا اسے چھوڑ کر انہوں نے دوسرے خدا

---

[1] لسان العرب بذیل مادہ؛

[2] دیوان عنترہ ص ۲۴؛

هاتوا برهانکم، هذا ذکر من معی وذکر من قبلی بل اکثرهم لا یعلمون الحق فهم معرضون (الانبیاء ۲۴)

بتا دیجئے ہیں۔ اے نبیؐ ان سے کہو کہ لاؤ اپنی دلیل۔ یہ کتاب بھی موجود ہے جس میں میرے دور کے لوگوں کے لئے نصیحت ہے اور وہ کتابیں بھی موجود ہیں جن میں مجھ سے پہلے لوگوں کے لئے نصیحت تھی، مگر ان میں سے اکثر لوگ حقیقت سے بے خبر ہیں، اس لئے منہ موڑے ہوئے ہیں۔

۲۔ نماز، دعا، حمد و مناجات اور ہر وہ کام جو عبادت کی غرض سے کیا جائے، قرآن نے اسے ذکر سے تعبیر کیا ہے۔

قد افلح من تزکی وذکر اسم ربہ فصلی (الاعلیٰ ۱۵)

فلاح پا گیا وہ جس نے پاکیزگی اختیار کی اور اپنے رب کا نام یاد کیا پھر نماز پڑھی۔

الذین یذکرون اللہ قیاما وقعودا وعلی جنوبہم (آل عمران ۱۹۱)

جو اٹھتے بیٹھتے اور لیٹتے ہر حال میں خدا کو یاد کرتے ہیں۔

لفظ ذکر کے مذکورہ بالا مختلف معانی کو دیکھتے ہوئے یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ یہ ایسے الفاظ میں سے ایک ہے جو بیک وقت کئی معانی رکھتے ہیں، جنھیں لغوی اصطلاح میں "المشترک اللفظی" کہا جاتا ہے، تاہم اگر تمام معانی کو کسی ایک معنی میں محصور کیا جائے تو "قرآن" تمام مفاہیم کا جامع بن سکتا ہے، کیونکہ یہ یاد بھی ہے، یاد دہانی بھی، حکم بھی ہے اور فہمائش بھی، اقرار اور ایمان کا ذریعہ بھی ہے اور رضائے الٰہی حاصل کرنے کا وسیلہ بھی، غرض ہر مفہوم کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے، جبکہ قبل از اسلام اس کے مفہوم میں اتنی وسعت نہیں تھی۔

المغفرة والاستغفار

غفر کے معنی ہیں کسی چیز کو ایسی چیز پہنا دینا جس سے وہ غلاظت وغیرہ سے محفوظ رہے، لہٰذا اس میں چھپانے اور محفوظ رکھنے کا مفہوم شامل ہوتا ہے۔ غفر المتاع فی الوعاء سامان کو کسی برتن میں چھپا دیا۔ اسی طرح ایک دوسرا محاورہ ہے غفر الشیب الخضاب خضاب نے بڑھاپے کو چھپا دیا کسی شاعر نے کہا ہے:

حتی اکتسیت من المشیب عمامۃ　　غفراء اغفر لونہا بخضاب[1]

اسی ظاہری معنی سے ترقی کر کے یہ لفظ معنوی طور پر بھی کسی چیز کو چھپانے کے لئے مجازاً استعمال ہونے لگا۔ چنانچہ برے کام، بری عادات اور بری باتوں کو درگذر کرنے کے لئے یہ لفظ بولا جانے لگا اسی مفہوم میں قرط الیف کا شعر ہے:

لئن قومی وان کانوا ذوی عدد　　لیسوا من الشر فی شیء وان هانا

یجزون من ظلم اهل الظلم مغفرۃ　　ومن إساءۃ اهل السوء احسانا[2]

نابغہ ذبیانی نے اور واضح انداز میں اسے اپنے کلام میں استعمال کیا ہے:

والغافر الذنب لاهل الحجی　　والقاطع الرحمن والواصل[3]

قرآن مجید میں غفر مغفرۃ اور اس کے مشتقات ۲۳۳ بار آئے ہیں۔ ان میں اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنیٰ غفور و غفار بھی شامل ہیں۔ قرآن مجید کے نزدیک مغفرۃ کا معنی گناہوں پر پردہ ڈالنا اور انہیں معاف کر دینا ہے:

---

[1] لسان العرب بذیل مادہ غفر

[2] تنزیل الآیات علی الشواہد من الابیات علی هامش الکشاف ۴/۳۲۵۶

[3] دیوان النابغہ ص ۱۶۷

قال رب انی ظلمت نفسی فاغفر لی فغفر له

پھر وہ کہنے لگا، اے میرے رب، میں نے اپنے نفس پر ظلم کر ڈالا میری مغفرت فرما دے۔

قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ ویغفر لکم ذنوبکم واللہ غفور رحیم

(آل عمران ۳۱)

اے نبی! لوگوں سے کہہ دو کہ "اگر تم حقیقت میں اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی اختیار کرو اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہاری خطاؤں سے درگذر فرمائے گا، وہ بڑا معاف کرنے والا اور رحیم ہے"۔

ان اللہ لا یغفر ان یشرک بہ ویغفر ما دون ذلک لمن یشاء

(نساء ۴۸)

اللہ بس شرک کو ہی معاف نہیں کرتا، اس کے سوا دوسرے جس قدر گناہ ہیں وہ جس کے چاہتا ہے معاف کر دیتا ہے۔

مذکورہ بالا تمام آیات میں مغفرۃ کا ایک ہی مفہوم ہے، استغفار اسی مادہ سے باب استفعال کا مصدر ہے، اس لفظ کے ارتقاء کی بھی وہی رفتار ہے جو مغفرۃ کی ہے، باب استفعال میں چلے جانے کی وجہ سے صرف اس قدر تبدیلی ہوئی ہے کہ اس میں طلب کا مفہوم ہو گیا ہے۔

والذین اذا فعلوا فاحشۃ او ظلموا انفسہم ذکروا اللہ فاستغفروا لذنوبہم ومن یغفر الذنوب الا اللہ ولم یصروا علی ما فعلوا وہم یعلمون

(آل عمران ۱۳۵)

اور جن کا حال یہ ہے کہ اگر کبھی کوئی فحش کام ان سے سرزد ہو جاتا ہے، کسی گناہ کا ارتکاب کرتے وہ اپنے اوپر ظلم کر بیٹھتے ہیں، تو معاً اللہ انہیں یاد آجاتا ہے، اور اس سے وہ اپنے قصوروں کی معافی چاہتے ہیں، کیونکہ اللہ کے سوا اور کون ہے جو گناہ معاف کر سکتا ہے، اور وہ کبھی دانستہ اپنے کئے پر اصرار نہیں کرتے۔

أفلا يتوبون إلى الله ويستغفرونه	پھر کیا یہ اللہ سے توبہ نہ کریں گے اور اس
والله غفور رحيم	سے معافی نہ مانگیں گے۔ اللہ بہت درگذر فرمانے
(المائدہ ۷۴)	والا اور رحم کرنے والا ہے۔

ان تفصیلات سے یہ بات واضح ہوئی کہ لفظ مغفرۃ کا استعمال دورِ جاہلیت میں زیادہ تر لغوی معنی میں ہوتا رہا ہے، مگر اسی زمانے میں ہی یہ لفظ مجازی طور پر غیر محسوس اشیاء کی ستر پوشی کے لیے بھی بولا جانے لگا تھا، قرآن مجید نے اس مجازی مفہوم کو معافی چاہنے اور معاف کرنے کے لیے خاص کر دیا، جس کے لیے توبہ، اور پھر گناہ نہ کرنے کے اقرار کی شرط رکھی، یہی مفہوم اصطلاح کا درجہ پا گیا، اور اتنی کثرت سے اس مفہوم میں مستعمل ہوتا ہے کہ کسی دوسرے معنی کی طرف گمان بھی نہیں جاتا۔

الحلال والحرام

الحلال والحرام: یہ دونوں الفاظ عربی الاصل ہیں، اور معنوی اعتبار سے متقابل و متضاد، اسی طرح ان دونوں لفظوں سے تعلق رکھنے والے اسماء، مصادر اور مشتقات بھی ایک دوسرے کے متقابل اور متضاد الفاظ کے طور پر استعمال ہوتے ہیں، مثلاً حلت و حرمت، تحریم و تحلیل، اور احلال و احرام وغیرہ باہم متقابل اور متضاد الفاظ ہیں، ان الفاظ کا تعلق معاشرت سے ہے کیا کام کرنا مناسب ہے اور کیا نہیں ہے، اس کا اظہار انہی الفاظ سے کیا جاتا ہے۔

اسلامی قوانین کی بنیادی اصطلاحات میں ان کا شمار ہوتا ہے، حلال جس چیز کے لئے بول دیا جائے وہ جائز و قابل قبول ہو جاتی ہے اور حرام جس کے ساتھ لگ جائے تو اس کے قریب پھٹکنا بھی ممنوع ہو جاتا ہے، بعض مصنفین نے حلال کے بجائے مباح کو حرام کا متضاد اور متقابل لفظ کے طور پر استعمال کیا ہے، کیونکہ حلال کی بہ نسبت یہ زیادہ جامع لفظ ہے، جس کے ضمن میں حلال اور جائز بھی آجاتے ہیں۔

ولا تقولوا لما تصف السنتکم الکذب هذا حلال وهذا حرام لتفتروا علی اللہ الکذب۔ (نحل ۱۱۶)	اور یہ جو تمہاری زبانیں جھوٹے احکام لگایا کرتی ہیں، کہ یہ چیز حلال ہے اور وہ حرام تو اس طرح کے حکم لگا کر اللہ پر جھوٹ نہ باندھو۔

حلال و حرام کا یہی معنی جاہلی ادب میں بھی مقبول تھا، عربوں کے یہاں حلال و حرام کا دار و مدار عرف و عادات اور موروثی روایات پر تھا، جس میں کسی حد تک انبیاء سابقین کی تعلیمات کا بھی دخل ہوتا، معاشرتی زندگی میں حلت و حرمت کا پورا خیال رکھتے، ذیل میں چند مثالوں کے ذریعہ ان کے تصور حلت و حرمت کی وضاحت کی جا رہی ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے جد امجد حضرت عبد المطلب نے ماء زمزم کے بارے میں فرمایا تھا

لا احلها لمغتسل وهی لشارب حل[1] — غسل کرنے والوں کے لئے یہ حلال نہیں ہے، پینے والوں کے لئے حلال ہے۔

ابن منظور نے لسان العرب میں ثعلب کا ایک شعر بے عیب کلام کے بارہ میں نقل کیا ہے جس میں "حلو حلال" کا لفظ استعمال کیا ہے۔

تصید بالحلو الحلال ولا ترى — على مكره يبدو لها فيعيب[2]

حضرت عبد المطلب نے حلال وحرام کا جو تصور پیش کیا ہے، اسی مفہوم میں قرآن مجید کی درج ذیل آیات بھی وارد ہوئی ہیں،

أحل الله البيع وحرم الربوا — اللہ نے تجارت کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام

(بقرہ ۲۷۵)

لا تحرموا طيبات ما احل الله لكم — جو پاک چیزیں اللہ نے تمہارے لئے حلال کی ہیں انہیں حرام نہ کرو،

(مائدہ ۸۷)

کلام عرب میں حلال وحرام کا استعمال قانونی مفہوم سے قدرے مختلف معنی میں بھی ہوا ہے، مگر بنیادی معنی کی روح اس میں بھی پائی جاتی ہے،

حلال کلام عرب میں اس وقت بولا جاتا ہے جب وہ اشہر حرم (محرم، رجب، ذی قعدہ، ذی الحجہ) ختم کرتے اشہر حل میں داخل ہوتے ہیں، اس کے برعکس حرام اس وقت استعمال کرتے ہیں جب اشہر حل کی مدت ختم ہو جاتی ہے، زہیر بن سلمیٰ کا شعر اسی معنی پر دلالت کرتا ہے،

جعلن القنان عن يمين وحزنه — وكم بالقنان من محل ومحرم[3]

---

[1] البدایہ والنہایہ ج ۲ ص ۲۷۴

[2] لسان العرب، ذیل مادہ حرم

[3] دیوان زہیر ص ۷۶

اور عمرو ذو الکلب الھذلی نے بھی اسی معنی میں یہ لفظ استعمال کیا ہے،

احرم اللہ ذلک من لقاء احاد احاد فی الشھر الحلال[1]

احرام کا دوسرا استعمال حج کے موقع پر مخصوص لباس کے لیے کیا جاتا ہے، یہ لباس پہن لینے کے بعد محرم کے لیے بہت سی حلال چیزوں کی بھی ممانعت ہو جاتی ہے، اور جب وہ احرام کھول دیتا ہے تو پھر یہ ممنوعات اس کے لیے حلال ہو جاتی ہیں۔

کفی حزنا کری علیہ کانہ لقی بین ایدی الطائفین حریم[2]

مذکورہ بالا دونوں مفاہیم پر قرآن مجید کی متعدد آیات دلالت کرتی ہیں۔ حرام اور حُرُم کے الفاظ مہینوں کی حرمت کے لیے درج ذیل آیات میں وارد ہوئے ہیں:

ان عدۃ الشھور عند اللہ اثنا عشر شھرا فی کتاب اللہ یوم خلق السموات والارض منھا اربعۃ حرم (توبہ ۳۶)	حقیقت یہ ہے کہ مہینوں کی تعداد جب سے اللہ نے آسمان و زمین کو پیدا کیا ہے اس کے نوشتے میں بارہ ہی ہے، اور ان میں چار مہینے حرام ہیں۔
فاذا انسلخ الاشھر الحرم فاقتلوا المشرکین حیث وجدتموھم (توبہ ۵)	پس جب حرام مہینے گذر جائیں تو مشرکین کو قتل کرو جہاں پاؤ،

حالت احرام کے لیے بھی قرآن مجید میں یہ لفظ آیا ہے۔

یا ایھا الذین آمنوا لا تقتلوا الصید وانتم حرم (مائدہ ۹۵)	اے لوگو جو ایمان لائے ہو، احرام کی حالت میں شکار نہ کرو،

---

[1] دیوان الھذلیین ج ۳ ص ۱۱۷

[2] لسان العرب بذیل مادہ حرم

حرم و حرام میں "تقدس" کا بھی ایک مفہوم پایا جاتا ہے، چنانچہ المسجد الحرام اور حرم کعبہ کے الفاظ اسی معنی کے مظہر ہیں۔ کلام عرب میں اس کی نظیریں بھی موجود ہیں، قیس بن الخطیم کا شعر ہے

والله ذی المسجد الحرام ... وما حلل من بمنة لها خنف

إنی لأهوالك غیر کاذبة ... قد شف منی الأحشاء والشغف[1]

اس مطالعہ سے یہ بات واضح ہوئی کہ حلال و حرام عربی ادب کا مقبول عام لفظ ہے، اور مختلف مفاہیم کا حامل ہے، جاہلی ادب میں بھی یہ بطور اصطلاح استعمال ہوتا رہا ہے، قرآن مجید نے اس مفہوم میں کوئی تبدیلی نہیں کی، البتہ اتنا ضرور ہے کہ اس کے استعمالات کو اسلامی احکام و قوانین کے لئے خاص کر دیا۔

[1] دیوان قیس بن الخطیم ص ۶۰ - ۶۱!

الجاهلية

الجاهلية: مادہ ج ہ ل. مصدر جہل و جہالۃ اسی جہل سے مشتق ہے، اور اسم فاعل جاہل سے صیغۂ نسبت ہے، لغت میں اسی لفظ کے دو معانی بیان ہوئے ہیں.

۱. نادانی، لاعلمی، یعنی علم کے ضد کے طور پر بولا جاتا ہے.

۲. جذباتیت، خشونت، بربریت وغیرہ جو حلم کا ضد ہے.

کلام عرب اور قرآن مجید دونوں میں اس کا استعمال مذکورہ بالا دونوں معانی میں ہوا ہے، پہلے معنی نادانی و لاعلمی کے بہترین استعمال کی مثال عنترہ کا یہ مصرعہ ہے:

هلا سألت الخيل يا ابنة مالك ان كنت جاهلة بما لم تعلمي [1]

اور دوسرا معنی جہل بمقابلہ حلم کی مثال کلام عرب میں بے شمار ہیں، اس سلسلے میں عمرو بن کلثوم کا یہ شعر بہت مشہور ہے.

ألا لا يجهلن أحد علينا فنجهل فوق جهل الجاهلينا [2]

اور نابغہ ذبیانی کا یہ شعر بھی اسی معنی کی ترجمانی کرتا ہے.

دعاك الهوى واستجهلتك المنازل وكيف تصابي المرء والشيب شامل [3]

قرآن مجید نے اس مادہ کے بہت سے مشتقات استعمال کیے ہیں، موقع و محل سے دونوں معانی کو مراد لیا ہے. جہل بمقابلہ علم کی مثال کے لیے دیکھئے درج ذیل آیات:

يحسبهم الجاهل اغنياء من التعفف ان کی خودداری دیکھ کر ناواقف آدمی گمان کرتا ہے کہ یہ خوشحال ہیں. (بقرہ ۲۷۳)

---

[1] شرح المعلقات السبع ص ۱۵۹

[2] شرح المعلقات السبع ۱۳۶ [3] دیوان النابغۃ ۱۱۵

قل أفغير الله تأمروني أعبد أيها الجاهلون (اے نبی) ان سے کہو پھر کیا اے جاہلو، تم اللہ
(زمر ۶۴) کے سوا کسی اور کی بندگی کرنے کے لیے مجھ سے کہتے ہو۔

یا ایها الذین آمنوا ان جاءکم فاسق بنبأ فتبینوا اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اگر کوئی فاسق تمہارے
ان تصیبوا قوما بجهالة فتصبحوا علی ما فعلتم پاس کوئی خبر لے کر آئے تو تحقیق کر لیا کرو، کہیں ایسا نہ
ندمین۔ (الحجرات ۶) ہو کہ تم کسی گروہ کو نادانستہ نقصان پہنچا بیٹھو اور
پھر اپنے کیے پر پشیمان ہو۔

اور جہل بمقابلہ حلم بمعنی جذباتیت و بربریت کے استعمال کے لیے حسب ذیل آیات ملاحظہ ہوں:

واذا خاطبهم الجاهلون قالوا سلاما اور جاہل ان کے منہ آئیں تو کہہ دیتے ہیں سلام!
(فرقان ۶۳)

خذ العفو وامر بالعرف واعرض عن اے نبی! نرمی و درگزر کا طریقہ اختیار کرو، معروف کی
الجاهلین (اعراف ۱۹۹) تلقین کیے جاؤ اور جاہلوں سے نہ الجھو۔

أئنکم لتأتون الرجال شهوة من دون کیا تمہارا یہی چلن ہے کہ عورتوں کو چھوڑ کر مردوں
النساء بل أنتم قوم تجهلون کے پاس شہوت رانی کے لیے جاتے ہو، حقیقت
(النمل ۵۵) یہ ہے کہ تم لوگ سخت جہالت کا کام کرتے ہو۔

یہاں قابل ذکر بات یہ ہے کہ جہل و جہالۃ عربی زبان کا کثیر الاستعمال لفظ ہے، ماخذ میں درجنوں طریقوں سے بار بار اس کا ذکر ملتا ہے۔ مگر صیغۂ جاہلیۃ سب سے پہلے قرآن مجید میں وارد ہوا ہے۔ اور مختلف سیاق و سباق میں چار مرتبہ اس کا ذکر آیا ہے

۱۔ غزوہ احد میں لشکر اسلام کو جس صورت حال کا سامنا کرنا پڑا، اس پر تبصرہ کرتے ہوئے قرآن نے کہا، ان میں ایک گروہ ایسا تھا جسے اللہ تعالیٰ کی قدرت و مرضی پر پورا اطمینان

تھا۔ اس پر اللہ کی مرضی سے نیند طاری ہوگئی اور وہ اطمینان سے سویا، مگر اس میں ایک گروہ ایسا بھی تھا جو اللہ و رسول کے مقابلہ میں اپنی صلاحیتوں پر نازاں تھا، وہ موقع پاتے ہی اللہ و رسول پر طعن و تشنیع کرنے لگا۔

ثم انزل علیکم من بعد الغم أمنة نعاساً	اس غم کے بعد اللہ نے تم میں سے کچھ لوگوں پر ایسی
یغشیٰ طائفة منکم وطائفة قد اهمتهم	اطمینان کی سی حالت طاری کر دی وہ اونگھنے لگے مگر
أنفسهم یظنون باللہ غیر الحق ظن الجا	ایک دوسرا گروہ جس کو اپنی ہی اہمیت بس اپنی
هلیة. یقولون هل لنا من الأمر من	ذات ہی کی تھی، اللہ کے متعلق طرح طرح کے جاہلانہ
شیئ قل ان	گمان کرنے لگا، جو سراسر خلاف حق تھے یہ لوگ
(آل عمران ۱۵۳)	اب کہتے ہیں، اس کام کے جیتنے میں ہمارا بھی
	کوئی حصہ ہے۔

صلح حدیبیہ کے پس منظر میں ارشاد ہوا ہے کہ کفار جب بالکل ہی مارنے مرنے پر تلے ہوئے تھے / بربریت پر آمادہ تھے، ہم نے مومنین کے دلوں میں صبر و سکون کی کیفیت بخش دی،

اذ جعل الذین کفروا فی قلوبهم الحمیة	جب ان کافروں نے اپنے دلوں میں جاہلانہ
حمیة الجاهلیة فانزل اللہ سکینته علی	حمیت بٹھالی، تو اللہ نے اپنے رسول اور مومنوں
رسوله وعلی المومنین والزمهم کلمة	پر سکینت نازل فرمائی اور مومنوں کو تقویٰ کی
التقویٰ (الفتح ۲۶)	بات کا پابند رکھا۔

ان دونوں آیات میں جاہلیت بطور اصطلاح استعمال ہوا ہے اور لغوی اعتبار سے اس میں جہل بمقابلہ حلم والا پہلو غالب نظر آتا ہے۔

اس کے علاوہ دو مقامات پر یہ لفظ اور آیا ہے:

أفحكم الجاهلية يبغون ومن احسن من الله حكما لقوم يوقنون (مائدہ ٥٠)

تو کیا یہ لوگ جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں حالانکہ جو لوگ اللہ پر یقین رکھتے ہیں، ان کے نزدیک اللہ سے بہتر فیصلہ کرنے والا اور کون ہو سکتا ہے۔

وقرن فی بیوتکن ولا تبرجن تبرج الجاهلية الاولى (احزاب ٣٣)

اور اپنے گھروں میں ٹک کر رہو، اور سابق دور جاہلیت کی سج دھج نہ دکھاتی پھرو۔

ان آیات میں اصطلاحی معنی ہی مقصود ہیں، مگر الفاظ پر گہرائی سے غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ زمانہ ماقبل میں جہالت پر مبنی قانون رائج تھا اور سماج میں جو فحش رسومات ایجاد ہو گئی تھیں، اس میں اگرچہ لاعلمی و نادانی کا تھوڑا بہت دخل بھی رہا ہے، مگر خرابی کا اصل سبب وہ فطری خشونت و نخوت تھی جو ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی، ایک مرتبہ کسی شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اپنے ایک ساتھی کی ماں کے لئے ایک نامناسب لفظ کہہ دیا تو آپ نے فرمایا:

انك امرؤ فيك جاهلية[1]

تم ایسے شخص ہو جس کے اندر روح جاہلیت ابھی باقی ہے۔

ان آیات و حدیث کے مفہوم پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید نے اسے ایک خاص مفہوم میں استعمال کیا ہے، بلاشبہ عربی ادب میں یہ اضافہ ہے، اور ایسے گراں قدر لفظ کا اضافہ جو پورے ایک عہد کی تاریخ پر محیط ہے، اور یہ ایسا مقبول ہوا کہ اصطلاح سے آگے بڑھ کر علم کا درجہ پا گیا، چنانچہ اس لفظ کے ساتھ جو جڑی ہوئی درجنوں کتابیں منظر عام پر آگئیں، اور بعض معاملات میں زمانہ جاہلیت سے مناسبت کی وجہ سے معاصر زمانہ کو بھی "جاہلیت جدیدہ" کہا جانے لگا۔

[1] الصحیح للبخاری، کتاب الایمان، باب المعاصی من امر الجاہلیۃ۔

مقدمة

۱۔ الاتقان فی علوم القرآن، جلال الدین سیوطی، تقدیم و تعلیق، مصطفی دیب البغا، دمشق، ۱۹۸۷ء

۲۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ، زیر اہتمام پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۱۹۶۶ء

۳۔ اساس البلاغۃ، زمخشری، المکتبۃ الذہبیہ، قاہرہ ۱۸۸۳ء

۴۔ اسس النقد الادبی عند العرب، د۔ احمد احمد البدوی، مکتبہ نہضہ، مصر، ۱۹۶۰ء

۵۔ الاسلام۔ عقیدۃ و شریعۃ، محمود شلتوت، دار العلم، بیروت، ۱۹۶۶

۶۔ الاشباہ والنظائر فی القرآن الکریم، مقاتل بن سلیمان البلخی، قاہرہ، ۱۹۷۵ء

۷۔ الاصمعیات، ابو سعید عبد الملک اصمعی، تحقیق احمد محمد شاکر و عبد السلام، قاہرہ، ۱۹۶۲ء

۸۔ تاج العروس فی جواہر القاموس، محمد مرتضی الزبیدی، بیروت، بدون تاریخ

۹۔ تدبر قرآن، امین احسن اصلاحی، فاران فاؤنڈیشن، لاہور، ۱۹۸۰

۱۰۔ ترجمان القرآن، ابو الکلام آزاد، ساہتیہ اکادمی، لیبع چہارم، ۱۹۸۴ء

۱۱۔ ترجمہ قرآن، سید ابو الاعلی مودودی، مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی، ۱۹۹۲ء

۱۲۔ تفہیم القرآن، سید ابو الاعلی مودودی، مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی، ۱۹۹۱ء

۱۳۔ تفسیر المراغی، احمد مصطفی المراغی، قاہرہ ۱۹۵۳

۱۴۔ تفسیر القرآن العظیم، السید رشید رضا، دار المنار، قاہرہ ۱۹۵۷ء

۱۵۔ تفسیر نظام القرآن، حمید الدین الفراہی، ترجمہ: امین احسن اصلاحی، اعظم گڑھ ۱۹۹۰ء

۱۶۔ التفسیر والمفسرون، محمد حسین الذہبی، دار الکتب الحدیثہ، بیروت ۱۹۷۶ء

۱۷۔ تنزیل الآیات علی الشواہد من الابیات علی حاشیۃ الکشاف، محب الدین افندی، دار الفکر، بیروت۔

۱۸۔ جامع ترمذی، محمد عیسیٰ ترمذی، کتب خانہ رشیدیہ، دہلی، بدون تاریخ

۱۹۔ جمہرۃ اللغۃ، ابن درید الازدی، مؤسسۃ الحلبی وشرکاہ للنشر، قاہرہ،

۲۰۔ دین کا قرآنی تصور، صدر الدین اصلاحی، مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی، ۱۹۷۹ء

۲۱۔ دیوان اعشیٰ، میمون بن قیس الاعشیٰ، شرح وتعلیق، محمد محمد حسین، بیروت، ۱۹۶۸ء

۲۲۔ دیوان اوس بن حجر، تحقیق۔ محمد یوسف نجم، دار صادر، بیروت ۱۹۶۷ء

۲۳۔ دیوان امرؤ القیس، تحقیق، ابو الفضل ابراہیم، دار المعارف، بیروت ۱۹۶۹ء

۲۴۔ دیوان امیہ بن ابی الصلت، المکتبۃ الاہلیۃ، بیروت ۱۹۳۴

۲۵۔ دیوان حاتم الطائی، دار بیروت للطباعۃ والنشر، ۱۹۷۴ء

۲۶۔ دیوان حسان بن ثابت۔ الہیئۃ المصریۃ العامۃ، ۱۹۷۴ء

۲۷۔ دیوان الحماسۃ، حبیب بن اوس ابو تمام الطائی، مکتبۃ محمد علی صبیح۔ قاہرہ ۱۹۵۵ء

۲۸ دیوان زہیر بن ابی سلمیٰ، دار صادر للطباعۃ والنشر، ۱۹۶۴ء

۲۹۔ دیوان الشماخ بن ضرار الذبیانی، تحقیق۔ صلاح الدین الہادی، مصر ۱۹۶۸ء

۳۰۔ دیوان طرفۃ بن العبد، تحقیق، علی الجندی، قاہرہ ۱۹۶۲ء

۳۱۔ دیوان عامر بن طفیل، دار صادر، بیروت ۱۹۶۳ء

۳۲۔ دیوان عنترہ بن شداد، تحقیق وتقدیم، فوزی عطوی، الشرکۃ اللبنانیۃ، بیروت، ۱۹۶۸ء

۳۳۔ دیوان قیس بن الخطیم، تحقیق ناصر الدین الاسد، دار العروبۃ، ۱۹۶۲ء

۳۴۔ دیوان لبید بن ربیعہ، دار صادر، بیروت (بدون تاریخ)

۳۵۔ دیوان النابغۃ الذبیانی، تحقیق، محمد ابو الفضل ابراہیم، دار المعارف، مصر، ۱۹۷۷ء

۳۶۔ دیوان الہذلیین، سید احمد الہاشمی، الدار القومیۃ، قاہرہ، ۱۹۶۵ء

٣٧. روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم والسبع المثانی، آلوسی، الطباعة المنیریة، دمشق،

٣٨. الزینة فی الکلمات الاسلامیة العربیة، ابوحاتم محمد بن احمد الرازی، مصر، ١٩٥٤ء

٣٩. سنن ابی داؤد، سلیمان بن اشعث ابی داؤد السجستانی، اصح المطابع، دہلی،

٤٠. السیرة النبویة، ابن هشام ابومحمد عبدالملک بن هشام، دار الجیل، بیروت، ١٩٧٥ء

٤١. شرح المعلقات السبع، الزوزنی، مکتبة البابی الحلبی، قاہرہ، ١٩٥٩ء

٤٢. شعر خفاف بن ندبة السلمی، تحقیق، نوری حمودی القیسی، مطبعة المعارف، بغداد، ١٩٦٨ء

٤٣. الشعر والشعراء، ابومحمد عبدالله بن مسلم، ابن قتیبة، دار الثقافة، بیروت، ١٩٦٩ء

٤٤. الصاحبی، احمد بن فارس، المکتبة السلفیة، قاہرہ، ١٩١٠ء

٤٥. الصحیح للبخاری، محمد بن اسماعیل البخاری، اصح المطابع، دہلی، ١٣٢٥ء

٤٦. الصحیح لمسلم، مسلم بن الحجاج نیشاپوری، اصح المطابع، دہلی، ١٣٢٦ء

٤٧. عبدالله حمید الدین فراہی، حیات وافکار، (مقالات فراہی سیمینار) ترتیب: عبید الله فراہی، دائرہ حمیدیہ، مدرسۃ الاصلاح، سرائمیر، اعظم گڑھ، ١٩٩٢ء

٤٨. علم اللغة. علی عبدالواحد وافی، دار نهضة، مصر، قاہرہ (بدون تاریخ)

٤٩. فجر الاسلام، احمد امین، دار الکتاب العربی، بیروت، ١٩٦٩ء

٥٠. فرہنگ آصفیہ، سید احمد دہلوی، ترقی اردو بیرو، نئی دہلی ١٩٨٢ء

٥١. فقه الزکاة، یوسف القرضاوی، دار الاشراق، بیروت ١٩٦٩ء

٥٢. فقه اللغة، علی عبدالواحد وافی، دار نهضة، مصر،

٥٣. قرآن مجید کی چار بنیادی اصطلاحیں، سید ابوالاعلیٰ مودودی، دہلی، ١٩٧٣ء

٥٤. کتاب الاسماء والصفات، البیهقی، الہ آباد، ١٣١٣ء

٥٥. كتاب الاصنام، ابو المنذر، هشام بن السائب الكلبي، الدار القومية، قاهرة ١٩٦٥م

٥٦. كتاب الاوائل، ابو هلال العسكري، مطبعة دار امل، المغرب الاقصى، ١٩٦٦م

٥٧. كشاف اصطلاحات الفنون، محمد علي التهانوي، كلكتة، ١٨٦٢م

٥٩ لحن العامة والتطور اللغوي، رمضان عبد التواب، دار المعارف، مصر

٦٠. لسان العرب، جمال الدين محمد بن مكرم الانصاري، ابن منظور، مصر

٦١. محيط المحيط، بطرس البستاني، بيروت ١٨٧٠م

٦٢. المدخل الفقهي العام، احمد مصطفى الزرقاء، دمشق ١٩٨٣م

٦٣. المسند للامام احمد، قاهرة ١٩٥٩م

٦٤. مصادر الشعر الجاهلي، ناصر الدين اسد، دار المعارف، ليبيا نجم، مصر ١٩٧٨م

٦٥. معارف القرآن، محمد شفيع، بيت الحكمة، بيروت، ١٩٨٢م

٦٦. معروف ومنكر، سيد جمال الدين عمري، مركزي مكتبه اسلامي، دلهي، ١٩٦٦م

٦٧. المفردات في غريب القرآن، راغب اصفهاني، المطبعة الميمنية، قاهرة ١٣٢٤م

٦٨. مفردات القرآن، المعلم عبد الحميد الفراهي، دائرة حميدية، ١٣٥٨م

٦٩. المفضليات، المفضل بن محمد ابن يعلى، تحقيق، الاستاذ احمد محمد شاكر وعبد السلام هارون، مصر ١٩٦٢م

٧٠. مقدمة ابن خلدون، ابن خلدون، بيروت ١٩٥٢م